بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیادگار: حضور حافظِ ملت علامہ شاہ الحاج عبدالعزیز قدس سرہٗ بانی الجامعۃ الاشرفیہ

الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی اور علمی ترجمان

ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور

زیرِ سرپرستی:

عزیزِ ملت حضرت علامہ شاہ الحاج عبدالحفیظ صاحب قبلہ

سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ

جلد نمبر ۴۱ شمارہ ۷ | جولائی ۲۰۱۷ء | شوال المکرم ۱۴۳۸ھ

مجلس ادارت

مدیر اعلیٰ: مبارک حسین مصباحی

نائب مدیر: محمد طفیل احمد مصباحی

منیجر: محمد محبوب عزیزی

تزئین کار: مہتاب پیامی

مجلسِ مشاورت

مولانا محمد احمد اعظمی مصباحی

مفتی محمد نظام الدین رضوی مصباحی

مولانا محمد ادریس بستوی مصباحی

مولانا عبدالمبین نعمانی مصباحی

ترسیل زر و مراسلت کا پتہ

دفتر ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور

اعظم گڑھ یو۔پی۔ ۲۷۶۴۰۴

THE ASHRAFIA MONTHLY

Mubarakpur. Azamgarh

(U.P.) India. 276404

قیمت عام شمارہ: 25 روپے

سالانہ: 250 روپے

چیک اور ڈرافٹ

بنام

مدرسہ اشرفیہ

بنوائیں

کوڈ نمبر ——— 05462

دفتر ماہنامہ اشرفیہ ——— 250149

الجامعۃ الاشرفیہ ——— 250092

دفتر اشرفیہ ممبئی فون/فیکس 23726122

سری لنکا، بنگلادیش، پاکستان، سالانہ

500 روپے

دیگر بیرونی ممالک

$ 20 امریکی ڈالر £ 15 پونڈ

نوٹ: آپ ماہنامہ اشرفیہ ہر ماہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

http://www.aljamiatulashrafia.org E.mail: ashrafiamonthly@gmail.com

مولانا محمد ادریس مصباحی نے نشاط آفسیٹ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

مشمولات

اداریہ	مقابلہ جاتی امتحانات میں مسلمانوں کی نمائندگی	محمد طفیل احمد مصباحی	۳
	تحقیقات		
علمی تحقیق	طلاقِ ثلاثہ کا ثبوت: احادیث کی روشنی میں	مفتی آلِ مصطفیٰ مصباحی	۵
	فقہیات		
آپ کے مسائل	کیا فرماتے ہیں............	مفتی محمد نظام الدین رضوی	۸
	نظریات		
فکر امروز	مسلم پرسنل لا بورڈ مسلمانوں کا نمائندہ نہیں	صادق رضا مصباحی	۱۰
	اسلامیات		
شعاعیں	لباس کا بنیادی مقصد	حافظ محمد ہاشم قادری مصباحی	۱۲
بزم تصوف	فقہ و تصوف کا باہمی امتزاج	محمد طفیل احمد مصباحی	۱۵
	تاریخیات		
مدارس	اسلام کی ترویج و اشاعت میں مدارس اسلامیہ کا کردار	محسن رضا ضیائی	۲۱
	شخصیات		
انوارِ حیات	مفتی غلام سرور لاہوری: حیات و خدمات	محمد ثاقب رضا قادری	۲۵
یادِ رفتگاں	فاتحِ عیسائیت حضرت مولانا آلِ حسن موہانی اور ردِّ وہابیت	میثم عباس قادری رضوی	۳۴
	سیاسیات		
آئینۂ عالم	میانمار میں اسلام اور مسلمان	پروفیسر شارق جمال اعظمی	۳۹
	بزمِ دانش		
فکر و نظر	شاعری میں تصوف کی جلوہ ریزیاں	ڈاکٹر محی الدین حبیبی/مہتاب پیامی	۴۳
	ادبیات		
نقد و نظر	فیضان المناظرہ (مناظرہ رشیدیہ کا خلاصہ)/اسلام کا نظامِ طلاق	تبصرہ نگار: محمد طفیل احمد مصباحی	۵۱
خیابانِ حرم	نعتیں	شفیق رائے پوری/شاداب رضا حمتی/سید محمد نور الحسن نور	۵۳
	مکتوبات		
صدائے بازگشت	محمد عباس ازہری/کلیم اشرف رضوی		۵۴
	سرگرمیاں		
خیر و خبر	جامعہ اسلامیہ یتیم خانہ نیا نگر میرا روڈ میں جلسہ تقسیم انعامات/ دار العلوم محمدیہ ممبئی کا ۴۲؍ واں جلسہ دستار فضیلت/حیدر آباد دکن میں دعوتِ اسلامی کا تین روزہ اجتماع۔		۵۵

اداریہ

مقابلہ جاتی امتحانات میں مسلمانوں کی نمائندگی

محمد طفیل احمد مصباحی

مذہب اسلام کے تمدّنی نظام میں "علم و حکمت" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ تمدّن و ثقافت جس کی موجودہ تعبیر "کلچر" سے کی جاتی ہے، اس کے آٹھ (۸) اصول و مبادی ہیں۔ تمدّن کا چوتھا اصل "علم" ہے جسے اصل الاصول کا درجہ حاصل ہے۔ علم کے بغیر تمدّن کی حیثیت ایک جسمِ بے روح کی ہے۔ علم کے بغیر دنیا کی کوئی قوم نہ ترقی کر سکتی ہے اور نہ دنیا کی متمدن اقوام کی فہرست میں اپنا نام درج کرا سکتی ہے۔ یہ نظریہ عام ہے اور دنیا کا ہر ایک طبقہ اسے تسلیم کرتا ہے کہ No Education, No Development یعنی "تعلیم نہیں تو ترقی نہیں۔" مادّی و روحانی ترقّی کا راز تعلیم ہی میں پوشیدہ ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور میں قیادت و سیادت اور دنیا کی امامت کا سہرا اسی قوم کے سر بندھا ہے، جو تعلیم کے میدان میں سب سے آگے تھی۔ تعلیمی لحاظ سے مسلمانوں کا ماضی بڑا تابناک اور شاندار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی قیادت و سربراہی اور حکومت و اقتدار کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں رہی اور جب سے ہم نے تعلیمی سے منہ موڑا، ادبار و انحطاط کے شکار ہو گئے۔ دینِ اسلام نے جس شدّومد کے ساتھ حصولِ علم کی تاکید کی ہے، اس کی مثال دیگر مذاہب میں نہیں ملتی۔ قرآن مقدس میں: ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون اور: وقل رب زدنی علما۔ کہہ کر علم کی اہمیت و افادیت کا اعلان کیا گیا ہے اور حدیث پاک میں: طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم اور العلم نور جیسے حوصلہ افزا کلمات کے ذریعے علم کی عظمت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علم، انسان کے روشن مستقبل کا ضامن اور دین و دنیا کی فلاح و بہبود کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ دنیا کی قیادت و سربراہی مسلمانوں کے ذمّہ سونپی گئی ہے اور انھیں "خیر امّت" کا معزّز خطاب دے کر امر بالمعروف ونہی عن المنکر یعنی دعوت و تبلیغ جیسا مہتم بالشان دینی منصب عطا کیا گیا ہے۔ اور یہ ظاہر سی بات ہے کہ تعلیمی کے بغیر دعوت و تبلیغ ناممکن ہے۔ تبلیغی کارواں کو آگے بڑھانے اور اہل جہاں کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعے منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان جیسی داعی قوم علم و حکمت کی بے بہا دولت سے مالا مال ہو۔ علم کی روشنی اس کے پاس ہو، تاکہ وہ دنیا کی ظلمت کا خاتمہ کر سکے۔ عصر حاضر میں ہمارا دعوتی مشن اس لیے ناکام ہے کہ ہمارے پاس جدید تقاضوں کے مطابق عصری علوم کا فقدان ہے۔ دنیا عصری علوم کے پیچھے دوڑ رہی ہے، انگریزی زبان میں بات کر رہی ہے، انگریزی زبان سمجھ رہی ہے۔ لیکن افسوس، صد افسوس! ہم مسلمان دینی علوم سے بھی کما حقہ واقف نہیں۔

عربی و فارسی اور انگریزی م زبان کا جاننا تو دور کی بات ہے، ہم اپنی مادری زبان "اردو" سے بھی ناآشنا ہیں۔ جدید سائنس و ٹیکنالوجی کا علم کیا حاصل کرتے، شریعت کے بنیادی مسائل اور اس کے ضروری احکام تک سے ناواقف ہیں۔ نتیجہ نگاہوں کے سامنے ہے کہ تعلیمی یافتہ اقوام حاکم ہیں اور ہم محکوم بن کر زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ دنیا کی متمدن اور تعلیمی یافتہ اقوام کے مقابل اپنی حیثیت منوانے اور تعمیر و ترقی کے اعلیٰ مراحل طے کرنے کے لیے دینی و عصری علوم میں امتیاز و مہارت حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔

عصری تعلیمی کا حصول، سائنسی علوم سے استفادہ اور سائنسی نقطۂ نظر سے دین کی تفہیم و تبلیغی، وقت کا تقاضا اور حالات کا جبری مطالبہ ہے۔ مسلمان ایک زندہ قوم ہے اور زندہ قومیں نامساعد حالات پر آنسو بہانے اور ماضی کے شکست و ریخت پر کفِ افسوس ملنے کے بجائے حال کو غنیمت جان کر روشن مستقبل کے لیے لائحۂ عمل تیار کرتی ہیں۔ مسلمانوں کو اس نکتہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

مغل سلطنت کے زوال اور خاص طور سے ملک کی آزادی ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کی ہمہ جہت پسماندگی کا جو افسوس ناک دور ہوا ہے، اس میں آئے دن اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ آج سے بارہ سال قبل مارچ ۲۰۰۵ء میں مسلمانوں کی سماجی، تعلیمی، معاشی اور اقتصادی صورت حال کی جانچ پڑتال کے لیے راجندر سچر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس وقت کے وزیر اعظم منموہن سنگھ نے مسلمانوں کے سماجی حالات جاننے کے لیے جسٹس راجندر سچر کی قیادت میں ایک سات رکنی ہائی لیول کمیٹی تشکیل دی تھی۔ نومبر ۲۰۰۶ء میں جب کمیٹی نے اپنی رپورٹ حکومت کے سامنے پیش کی اور مسلمانوں کی ہمہ جہت پسماندگی کا حال سامنے آیا تو پورا ملک حیران اور انگشت بدنداں رہ گیا۔ مسلمانوں کو تعلیمی و سیاست اور ملازمت میں اپنی ناکامی کا سخت احساس ہوا اور وہ اپنی قسمت پر آنسو بہانے لگے۔ دانش مندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ مسلمان آہ و فغاں کرنے کے بجائے تلافیِ

مافات کا راستہ ڈھونڈتے اور حکومت کو کوسنے اور اپنی مظلومی کی داستان سنانے کے بجائے ہوش کے ناخن لیتے اور تعلیمی میدان میں آنے کی کوشش کرتے۔ مگر افسوس کہ ایسا کچھ نہ ہوا۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق سرکاری اداروں میں مسلمانوں کی شرکت اور نمائندگی کچھ اس طرح تھی:

*آئی. اے. ایس. : ۳. ۸ فیصد (3.8%) *آئی. پی. ایس. / سیکوریٹی ایجنسیاں: ۴ر فیصد (4%)
*گورنمنٹ ملازمت : ۷ر فیصد (7%) *ریلوے محکمہ : ۴. ۵ (4.5%)
*محکمۂ صحت : ۴. ۵ (4.5%)

مقامِ مسرت ہے کہ گذشتہ ۱۲ر سال میں تعلیمی اعتبار سے مسلمانوں میں تھوڑی بہت بیداری آئی ہے اور مسلم طلبہ اور طالبات اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے ہیں۔ مدارس اسلامیہ کے طلبہ بھی کالج اور یونیورسٹی کا رخ کر کے دینی و عصری علوم میں نمایاں کامیابیوں سے ہمکنار ہو رہے ہیں۔

اس وقت اگرچہ مسلمانوں میں تعلیمی بیداری آئی ہے، لیکن پھر بھی اعلیٰ تعلیم اور مقابلہ جاتی امتحانات میں مسلمانوں کی نمائندگی تین یا چار فیصد سے زیادہ نہیں۔ جس جمہوری ملک میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد تیس کروڑ سے بھی زائد ہو، وہاں کے اعلیٰ تعلیمی شعبوں میں مسلم طلبہ و طالبات کی تین یا چار فیصد نمائندگی، نہایت افسوس کی بات ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مسلمانوں میں بلند فکر، اعلیٰ ذہانت اور روشن دماغ رکھنے والے افراد و طلبہ کی کمی ہے۔ سب کچھ ہے اور اگر کسی چیز کی کمی ہے تو وہ وسائل کا فقدان، اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بھید بھاؤ اور صحیح سمت میں مسلم طلبہ کی رہنمائی کا فقدان ہے۔ ہمارے ملک میں مسلم طلبہ و طالبات اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے زیادہ تر ڈاکٹر، انجینئر یا ایم. بی. اے. کا شعبہ اختیار کرتے ہیں اور ان شعبوں میں محنت و مشقت کر کے ڈگری لے لیتے ہیں اور اس سے آگے بڑھنے کا نہیں سوچتے۔ یہی وجہ ہے کہ مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیابی حاصل کر کے سول سروسز کے شعبے میں مسلم طلبہ و طالبات کی نمائندگی تین فیصد سے آگے نہیں بڑھ پاتی ہے۔

سول سروس کے امتحانات: ہمارے ملک ہندوستان میں اعلیٰ سطحی مقابلہ جاتی امتحانات میں "سول سروس" کا امتحان بڑا دشوار اور کٹھن ہوا کرتا ہے۔ سول سروس ایک بہت ہی باعزت اور طاقت ور شعبہ ہے، مگر مسلم طلبہ اس میں قدم رکھنے سے گھبراتے اور اپنا دامن بچاتے ہیں۔ طلبہ اس کا نام سن کر ہی گھبراتے ہیں۔ .U.P.S.C (یونین پبلک سروس کمیشن) کے ذریعے سول سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد طلبہ حکومت کا ایک اٹوٹ حصّہ بن کر افسری خدمات انجام دینے کے اہل قرار پاتے ہیں۔ "سول سروسس" میں فی الوقت ۲۸ر شعبہ جات ہیں، جن میں آئی. اے. ایس. (انڈین ایڈ منسٹریٹیو سروس) آئی. پی. ایس. (انڈین پولیس سروس)، آئی. ایف. ایس. (انڈین فارین سروس)، آئی. آر. ایس. (انڈین ریوینیو سروس)، انڈین پوسٹل سروس، انڈین ریلوے سروس وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان امتحانات میں شرکت کے لیے کسی بھی فیکلٹی (شعبہ) میں گریجویشن کافی ہے۔ سول سروس کے اعلیٰ سطحی مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کی سرکاری ملازمت یقینی ہوا کرتی ہے اور ان کامیاب امیدواروں کو ڈی. ایم. ایس، پی آفیسر اور کلکٹر کے لیے مختلف ریاستوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ سول سروس کے دیگر شعبہ جات کے کامیاب امیدواروں کو مخصوص ریاست کے بجائے ہندوستان کے کسی بھی شہر میں سرکاری خدمات انجام دینے کی ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں۔

آزادیٔ وطن ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کی پسماندگی اور تعلیمی انحطاط کے نتیجے میں ذہانت و اہلیت رکھنے کے باوجود مسلم نوجوان "سول سروس" کے امتحانات میں شریک ہو کر افسر شاہی گروہ میں شامل ہونے اور حکومتی سطح پر گراں قدر خدمات انجام دینے سے بہت دور رہے۔ پچھلے پانچ برسوں سے جو مسلم طلبہ "سول سروسس" کے امتحانات میں حصہ لے کر کامیابی سے ہمکنار ہو رہے ہیں، ان کا مجموعی فیصد تین ہے۔ ۲۰۱۲ء میں سول سروسس کے مقابلہ جاتی امتحانات میں ۹۹۸ر امیدوار کامیاب ہوئے، جن میں مسلم امیدوار محض ۳۱ر تھے، ۲۰۱۳ء میں ۳۴ر مسلم طلبہ کامیاب ہوئے اور ۲۰۱۴ء میں ۱۲۳۶ر امیدوار کامیاب ہوئے، ان میں ۴۰ر مسلم طلبہ کامیاب رہے۔ ۲۰۱۵ء میں ۳۷ر مسلم امیدوار سول سروسس کے امتحان میں کامیاب ہو کر حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے۔

۲۰۱۶ء کے سول سروسس کے امتحان اور اس کے حالیہ رزلٹ میں پچاس مسلم طلبہ کی کامیابی سے مسلم طبقہ میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ہے اور اس نے سابقہ ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ کل ۱۰۹۹ر امیدواروں نے اس امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے جس میں سب سے ٹاپ ۱۰۰ر طلبہ میں ۱۰ر طالب علم مسلمان ہیں۔ اللہ کرے کہ اکیسویں صدی مسلمانوں کے تعلیمی انقلاب و ترقی کی صدی ثابت ہو اور مسلمان علوم و فنون کے میدان میں اپنی فتح و کامرانی کا پرچم لہرا سکے۔ آمین۔ ■■■

طلاقِ ثلاثہ کا ثبوت: احادیث کی روشنی میں

☆مفتی آلِ مصطفیٰ مصباحی

پرنٹ میڈیا خصوصًا الکٹرانک میڈیا کے ذریعے یہ بات حکومت کے حوالے سے پوری دنیا میں مشتہر کرائی جا چکی ہے کہ مطلقہ خاص کر بیک نشست تین طلاق سے مطلقہ عورت مظلومہ ہے، اور اس کے ظلم کا مداوا صرف یہ ہے کہ ایک وقت میں دی ہوئی تین طلاقوں کو واقع ہی نہ مانا جائے، اسے کالعدم قرار دیا جائے، اس تعلق سے ۱۴/ تا ۱۸/ مئی ۲۰۱۷ء سپریم کورٹ میں سماعتیں بھی ہوئیں اور فیصلہ محفوظ کر لیا گیا، چوں کہ کورٹ کے پاس فی الحال وقت نہ تھا، اس لیے تعدد ازدواج (ایک سے زائد شادی) اور حلالہ جیسے موضوع پر سماعت نہیں کی گئی، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ فرصت اور وقت کا انتظار ہے۔ کورٹ ان دونوں مسئلوں پر بھی غور کرے گا، اس وقت مسلم عورتوں کے ساتھ اقتدارِ اعلی پر فائز وزیر اعظم کا اظہار ہمدردی کچھ زیادہ ہی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کی ہمدردی و دلچسپی مسلم عورتوں کے لیے تعلیم کے مواقع پیدا کرنے، ان کی زندگی کو معیاری بنانے اور سماجی و معاشرتی اور سیاسی پسماندگی کو دور کرنے میں نہیں بلکہ۔ صرف مسئلہ طلاق میں ہے، وہ بھی اس بھونڈے انداز میں کہ اسلامک لاء ہی کو تبدیل کرا دیا جائے اور بیک نشست تین طلاق کو کالعدم قرار دیا جائے، اور اس پر بھی غور کرنے کی زحمت نہ کی جائے کہ طلاق کی واردات کا فیصد کیا ہے؟ اور کیا اتنی قلیل تعداد جو فیصد کے صرف دو چار اعشاریہ میں ہو، اس کے اسباب کیا ہیں؟ اور اس کا تدارک کیا ہے؟ ہمیں یہ تو نہیں معلوم کہ اس جمہوری ملک کے دستور میں جہاں ہر شہری کو اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی ہے، اور قیام جمہوریت کا مقصد بھی یہی ہے، آخر وہ کون سا قانون ضمنًا یا اصالۃً موجود ہے، جس کی تنقیح و تشریح میں دستور میں دی گئی مذکورہ آزادی کھوکھلی اور بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے، اور حکومت کو من مانی کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ البتہ اتنی بات ہم ضرور جانتے ہیں کہ کسی بھی حکومت کا کام نہ تو فتویٰ دینا ہے اور نہ ہی کسی مذہب کے عائلی اور غیر عائلی اسلامک لاء کو تبدیل و ترمیم کے سان پر چڑھانا، اور انتشار پیدا کرنا، حکومتوں کا کام ان اسباب کا پتہ لگا کر تدارک کرنا ہے، جہاں سے خرابیاں جنم لیتی ہیں، یہ بات ارباب حکومت کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مسلم سماج میں طلاق کی کثرت نہ تو تعلیم یافتہ سماج میں ہے، اور نہ ہی معیاری و اُونچے معاشرہ میں تعلیم یافتہ اور معیاری سماج میں طلاق ضرورت کے تحت ہوتی ہے، اور بہت کم وہ بھی بہت غور و فکر کے بعد، ہاں! وہ سماج جو جہالت زدہ ہے، غیر تعلیم یافتہ ہے، شرابی جواری کھلاڑی ہے، جن کا سماج میں معیار انتہائی پست ہے، وہاں طلاقیں ہوتی ہیں، اور زیادہ تر غیر شرعی طریقے پر طلاقیں دی جاتی ہیں، تو حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایسے پست سماج کو معیاری بنائے، تعلیم یافتہ بنائے، سماجی برائیوں کے خاتمے کے لیے قانون بنائے، مذہبی امور میں مداخلت نہ حکومت کی ذمہ داری ہے، نہ اس کے دائرہ اختیار میں ہے۔

یہ کہنا سر تا سر غلط ہے کہ طلاق فی نفسہ ظلم ہے، طلاق زن و شوہر کے درمیان تلخی کی صورت میں علاحدگی کا ایسا آپشن ہے، جس کی معقولیت کو پوری دنیا کے اہل عقل تسلیم کرتے ہیں، خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، اس لیے طلاق کو ظلم کہنا سخت نامعقولیت ہے، جن مذاہب میں تلخی کے باوجود رشتۂ ازدواج سے علیحدگی کا متبادل نہیں ہے، وہاں رشتوں میں تلخی کے بعد اپنی بیوی کو جلا کر مار ڈالنے، قتل کرنے، گلا گھوٹنے، ناقابل بیاں اَذیت دینے اور کسی بھی غیر قانونی طریقے سے شریک زندگی کو راستے سے ہٹانے کے واقعات بکثرت ہوتے ہیں، جن سے حکومتیں بھی اچھی طرح واقف ہیں، اسلام نے میاں بیوی کے درمیان نباہ نہ ہونے کی صورت میں طلاق کو متبادل رکھ کر اپنے ماننے والوں پر عظیم احسان فرمایا ہے، اس میں بھی دونوں کا لحاظ رکھا گیا ہے، عورت اگر اپنے شوہر کی بد خلقی و کج روی کی وجہ سے اس کے پاس رہنا نہ چاہتی ہو تو کچھ مال دے کر شوہر سے خلع کرانے کا متبادل موجود ہے، ورنہ قاضی اسلام کی قضا سے وجوہ فسخ کی بنیاد پر فسخ کرانے کا حق عورتوں کو حاصل ہے، بعض حالات کے پیش نظر خود عورت کا مطالبہ طلاق یا خلع کرنا طلاق کے فی نفسہ ظلم نہ ہونے اور

طلاق کے آپشن کی معقولیت کو واضح کرتا ہے، کیوں کہ طلاق اگر ظلم ہوتا تو مظلومہ خود اس کا مطالبہ کیوں کرتی، اس لیے اسلام نے طلاق کو بوقت ضرورت مشروع رکھا ہے، طلاق چوں کہ رشتے کو جوڑنے والی نہیں بلکہ توڑنے والی چیز ہے، اس لیے حدیث پاک کی صراحت کے مطابق مباح چیزوں میں اللہ عزوجل کے نزدیک سب سے نا پسندیدہ و مبغوض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زن و شوہر کے درمیان تلخی و نزاع کی صورت پیدا ہوجائے، جب بھی فوری طلاق دینا قرآن کریم کی ہدایات کے خلاف ہے، سورہ نساء کی آیت نمبر ۳۴/ میں اصلاح کی جو صورتیں بتائی گئی ہیں، اگر ان صورتوں سے بھی عورت اصلاح پذیر نہ ہو، تب طلاق کی اجازت دی گئی ہے، وہ بھی اس مخصوص طریقے پر جو سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۹/ میں ہے۔

فقہاے اسلام کے یہاں طلاق کا ایک مفصل باب ہے، جس میں طلاق احسن، حسن اور بدعی کی تفصیلات قرآن و حدیث کی روشنی میں موجود ہیں۔ بلفظ دیگر کس صورت میں اور کس طریقے پر طلاق دینا جائز ہے اور کس صورت میں طلاق دینا ناجائز و گناہ ہے، تین طلاق بیک نشست بھی انہیں صورتوں میں سے ایک ہے جس کا ناجائز و گناہ ہونا تمام اہل اسلام کے نزدیک مسلم ہے، لیکن یہ بات بھی اہل عقل کے نزدیک ثابت شدہ ہے کہ کسی چیز کے جرم و گناہ ہونے سے اس کی حقیقت موہوم یا معدوم نہیں ہو جاتی، وجود شے راہِ نیک سے ہو یا راہِ بد سے وہ شے بہر حال موجود و ثابت ہوتی ہے، اور جو لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ طلاق ثلاثہ کا ذکر قرآن کریم میں نہیں، صرف احادیث کریمہ میں ہے، وہ درحقیقت قران کی بات نہیں اپنے مُردہ ضمیر کی بات کرتے ہیں، اگر بالفرض صرف احادیث میں اس کا ذکر ہو، تو کیا احادیث قابل حجت و عمل نہیں ؟ حقیقت یہ ہے کہ قران کریم میں تین طلاق (خواہ بیک نشست ہو یا تعدد نشست) کا ذکر اتنی صراحت کے ساتھ ہے کہ اس کا انکار آیت کے انکار کے مرادف ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے قبل اہل عرب میں یہ دستور تھا کہ وہ جتنی بار چاہتے طلاق دے ڈالتے پھر رجوع کر لیتے، رجوع کے لیے کوئی تعداد مقرر نہ تھی، قران کریم نے اس من مانے دستور کا خاتمہ کیا اور ایک قانون عطا فرمایا کہ رجوع تو صرف دو طلاقوں تک ہی ہو سکتا ہے اور جب تیسری طلاق دے دی جائے تو اب رجوع نہیں اور بغیر حلالہ شوہر اول کے لیے وہ عورت حلال نہیں ہو سکتی، سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۹/ میں ہے: طلاق دو مرتبہ ہے، یا تو بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یا احسان اور اچھے سلوک کے ساتھ چھوڑ دینا، اور اگر تیسری طلاق دے دی گئی تو اب وہ عورت اس شوہر کے لیے حلال نہیں۔ یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ کسی فرقہ یا مذہب کے کسی فرد یا جماعت کو یہ حق قطعی حاصل نہیں کہ وہ قرآن کریم کی تشریح و تفسیر کرے، عند اللہ بھی اور ازاول تا آخر امت مسلمہ کے نزدیک بھی وہی تفسیر و تشریح قابل قبول ہے جو اس ذات گرامی سے منقول ہو جن پر قرآن کریم کا نزول ہوا۔ قران کی وہی تشریح لائق قبول و اعتماد ہے جو احادیث مبارکہ کی روشنی میں ہو، اور احادیث مبارکہ بیک نشست دی جانے والی تین طلاقوں کو تین ہونے پر نص ہیں، اور ایسے صاف و صریح اور محکم الفاظ میں جن میں کسی تاویل و تخصیص کی گنجائش نہیں، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں تو دو باتیں بڑی وضاحت کے ساتھ ہیں، ایک تو یہ کہ ایسی تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں، اور دوسری یہ کہ دینے والا گنہگار ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جب حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوال کیا تو آپ نے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا: اگر تم تین طلاقیں دیتے تو بیوی تم سے جدا ہوجاتی اور تیرا یہ فعل گناہ ہوتا۔

یہ روایت بیہقی کے علاوہ حدیث کی متعدّد کتابوں میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تمام فیصلے، صحابہ کے طلاق سے متعلق قضایا سب میں بیک نشست خواہ بہ نشست متعدّد دی جانے والی تین طلاقوں کو تین ہی مانا گیا، اور کبھی کسی سے اس کا خلاف منقول نہ ہوا، اس لیے ایک نشست میں دی جانے والی تین طلاقوں کے تین ہونے پر جمہور اہل اسلام متفق ہیں، اور اس تعلق سے چاروں مکاتب فقہ (حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی) کے ائمہ کا اجماع و اتفاق ہے، اور اختلاف بھی کیوں کر ہو کہ یہ مسئلہ مجتہد فیہ نہیں، قرآن و سنت کے صریح نصوص اس پر ناطق ہیں، قران کریم کی آیت نمبر ۲۲۹/ کا ترجمہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، اس میں تیسری طلاق کا حکم قران نے واضح انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں تیسری طلاق کے وقوع کے ذکر کے ساتھ کوئی قید نہیں ہے کہ تین الگ الگ طور پر ہو۔ یا۔ ایک نشست میں، جس کا صاف اور غیر مبہم مطلب یہ ہے کہ تین طلاق ایک ساتھ دی جائے یا متفرق طور پر، وہ بہر حال تین قرار پائیں گی اور بے حلالہ شوہر اول کے لیے حلال نہ ہو سکے گی۔

طلاق مرد کا حق ہے کہ نکاح کر لینے کے بعد قانون شرع کے مطابق یہ حق شوہر کو مل جاتا ہے، اس حق کے استعمال کے تعلق سے شریعت نے کچھ ہدایتیں دی ہیں تاکہ اس کا استعمال غلط ڈھنگ پر نہ ہو، اب اگر شوہر

اس حق کا استعمال شرعی ہدایات کے مطابق کرتا ہے تو وہ گنہگار نہ ہوگا، اور اگر غلط طریقے پر کرتا ہے تو گنہگار ہوگا، لیکن طلاق دونوں صورتوں میں بہرحال واقع ہو جائے گی، کسی فعل کے خلافِ ضابطہ و گناہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کے وجود ہی کا انکار کر دیا جائے اور اُسے موثر نہ مانا جائے، جس کی نظیر قتل ناحق، چوری، زنا وغیرہ ہے، قتل ناحق ایک بڑا جرم ہے، عظیم گناہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نکالنا کہ قتل کے بعد بھی فعل قتل واقع نہ ہوا اور مقتول حسب سابق زندوں میں شمار کیا جائے گا، کیوں کہ قتل جرم و گناہ ہے، پاگل ہی کا کام ہو سکتا ہے، اسی طرح زنا کاری، چوری بڑا جرم ہے، بڑا گناہ ہے، لیکن فعل زنا و فعل سرقہ کے وجود کا انکار کوئی سر پھرا ہی کر سکتا ہے، ٹھیک اسی طرح تین طلاق بیک نشست دینا شریعت مطہرہ کی نگاہ میں جرم ہے، گناہ ہے۔ طلاق دینے والا گنہگار ہوگا، لیکن وجود طلاق و تاثیر طلاق کا انکار ایک حقیقت ثابتہ کا انکار ہے، یوں ہی جو لوگ ایسی تین طلاق کو ایک طلاق مانتے ہیں وہ احمقوں کی جنت میں ہیں، تین کو ایک ماننا تو علم ریاضی کے اصول کی صریح مخالفت ہے، جس سے بچہ بچہ واقف ہے، دینے والا تین کا عدد استعمال کر رہا ہے، اور سر پھروں کی طرح ماننے والا اسے ایک مان رہا ہے، اس کی کوئی مثال علم ریاضی کی دنیا میں بھی نہیں دے سکتا، بیک نشست تین طلاق کو بالکلیہ طلاق نہ ماننا یا ایک ماننا اگر اس کے گناہ ہونے کی وجہ سے ہے، جیسا کہ شریعت سے بے خبر کچھ لوگوں کا ماننا ہے تو تمام ممنوعہ صورتوں میں طلاق واقع نہیں ہونی چاہئے، مثلاً حالت حیض میں اگر کوئی طلاق دیتا ہے، اگرچہ ایک ہی طلاق ہو تو طلاق واقع نہیں ہونی چاہئے، بلاضرورت طلاق دے تو بھی واقع نہ ہو، میں سمجھتا ہوں کہ زور زبردستی کرنے والے افراد اسے تسلیم نہ کریں گے، اور مذکورہ صورتوں میں طلاق واقع مانیں گے۔ لہٰذا بات صاف ہے کہ کسی فعل کا ارتکاب گناہ ہو تو اس سے وجودِ فعل و تاثیرِ فعل کا انکار حقیقت کا انکار ہے۔

یہی معاملہ بیک نشست طلاق ثلاثہ کا ہے، کہ وہ شریعت کی نگاہ میں گناہ ہے جرم ہے مگر وہ ضرور واقع ہوگی، ایسی صورت میں تین طلاق کے وجود سے انکار خواہ اسے بالکلیہ نہ مان کر ہو، یا ایک مان کر، ایک ثابت شدہ حقیقت کا انکار ہے، قانون طلاق بشمول طلاق ثلاثہ مسلمانوں کا اپنا خود ساختہ قانون نہیں، یہ اسلامی قانون ہے، الٰہی قانون ہے، جو جامع و مکمل ہے، اس میں ترمیم و تنسیخ اور ردو بدل کا اختیار صرف اللہ عزوجل کو ہے، پوری دنیا کے مسلمان بھی اگر اسے بدلنا چاہیں تو نہیں بدل سکتے، اسی لیے ارباب اقتدار کو یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اگر بنام مسلمان چند زر خرید مرد یا چند ضمیر فروش ناعاقبت اندیش عورتیں طلاق ثلاثہ کے الٰہی قانون و اسلامک لاء میں ترمیم کا مطالبہ کرتی ہیں تو وہ شوق سے کرتی رہیں، کسی کی زبان پر تالے نہیں لگائے جاسکتے، لیکن اس بہانے اسلامک لاء میں ہرگز تبدیلی نہیں ہو سکتی، نہ کسی حکومت و جماعت کو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

حکومت اگر واقعی مطلقہ بہ طلاق ثلاثہ عورتوں کی ہمدرد ہے، تو اسے چاہیے کہ بیک نشست تین طلاق بلکہ خلاف شرع دی جانے والی کسی بھی طلاق کے عمل کو شریعت کی طرح قانوناً بھی جرم و گناہ مان کر جرم کی بقدر سزا کا تعین کرے اور اس کی قرارداد پاس کرے، اور ان اسباب کا پتہ لگا کر ان کے تدارک کی سعی کرے جو طلاق بدعی کے وقوع کے سبب بنتے ہیں، کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تعلیم یافتہ سماج اور معیاری سماج میں طلاق کا وقوع بہت کم ہے، اگر یکا دُکا واقعات ہوتے بھی ہیں تو بہت سوچ سمجھ کر اور ناگزیر حالات میں، اس کے بر خلاف جہاں جہالت ہے، غیر معیاری سماج ہے، شراب و جوا اور کھیل جس کا وطیرہ ہے، اس سماج میں طلاق زیادہ ہوتی ہیں، اگرچہ فی صد کے لحاظ سے یہ بھی بہت کم ہے، خصوصاً طلاق ثلاثہ کے واقعات تو اور بھی کم ہیں، اخباری بیان کے مطابق اعشاریہ چار میں طلاق کے واقعات کا ریکارڈ ہے، جو دوسری قوموں کے رشتۂ ازدواج سے علیحدگی فی صد سے بھی کم ہے، حکومت کی ذمہ داری مذہب میں مداخلت کی نہیں، بلکہ جاہل سماج کو تعلیم یافتہ بنانے کی ہے، تعلیم کے مواقع ان کے لیے پیدا کر کے ایسے سماج کو معیاری بنانے کی ہے، تاکہ ایسے سماج والے اپنی زندگی کے تلخ و شیریں اور نشیب و فراز منزلوں کو سمجھ سکیں، اور اپنے لیے ضرر رساں چیزوں سے بچتے ہوئے سودمند امور کو اپنا سکیں۔ مگر ہمدردی کے نام پر موجودہ حکومت اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کر رہی ہے، اور مذہبی مداخلت کے ذریعے ہندوستانی مسلم سماج کو بُری طرح انتشار میں مبتلا کرنا چاہتی ہے، بلکہ اس طرح کا قانون لا کر مسلم سماج کو بھی اُسی سماج کے دھارے پر لانا چاہتی ہے، جہاں عورتوں کو جلانے، قتل کرنے، مارنے اور کسی طرح بھی راستے سے ہٹانے کے کثیر ظالمانہ واقعات رونما ہوتے ہیں، اگر طلاق ثلاثہ کے اسلامی لاء کو خدانخواستہ کالعدم قرار دے دیا گیا، تو اس سے فطری طور پر ایک بڑا طوفان کھڑا ہوگا، ایک طرف اہل اسلام کا مذہبی و الٰہی قانون ہوگا اور دوسری طرف حکومت کا اسلامک لاء مخالف قانون، جو آپس میں اس طرح ٹکرائیں گی جو کسی طرح بھی جمع نہیں ہو سکتیں۔ ■■■

آپ کے مسائل

مفتیِ اشرفیہ مفتی محمد نظام الدین رضوی کے قلم سے

چوڑی دار پاجامہ پہن کر نماز پڑھنے کا حکم

عورتیں جو لباس پہنتی ہیں ان میں ایک کپڑا جو چوڑی دار پاجامہ (یہاں گجرات میں "سلیکس" کہتے ہیں) اس میں بھی کتنے ایسے ہوتے ہیں جن میں چوڑی نہیں ہوتی، لیکن وہ پیروں سے یکدم چپکا ہوتا ہے، تو کیا ایسا کپڑا پہن کر عورت نماز پڑھ سکتی ہے؟

الجواب

عورت کے بدن میں چھبیس اعضا ایسے ہیں جن کا چھپانا فرض ہے، ان میں دونوں پنڈلیاں بھی ٹخنوں تک شامل ہیں، ان اعضا میں سے کوئی عضو چوتھائی حصے کی مقدار کوئی عورت قصداً کھولے، یا ایسا کپڑا پہنے جس سے وہ حصہ جھلکے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ فقہا نے کشفِ عورت کا حکم بیان کیا ہے، لیکن اگر کپڑا تنگ و چست ہو جس سے بدن کی ساخت، اونچ، نیچ اور ابھار وغیرہ ظاہر ہو تو نماز ہوگی یا نہیں؟ اس بارے میں فقہا کی تصریح فی الحال میری نگاہ میں نہیں۔ ہاں! یہ کشف تو نہیں ہے مگر کشف کے مشابہ ضرور ہے، جو ناجائز ہے اور عدم جواز پر مشتمل ہو کر جو نماز پڑھی جائے وہ مکروہ تحریمی ہوتی ہے، لہٰذا میری نگاہ میں یہ نماز مکروہ تحریمی، واجب الاعادہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اجماع کسے کہتے ہیں؟

ادھر کچھ دنوں سے بعض مسائل میں اجماع کا لفظ سننے میں آرہا ہے۔ کچھ علما فرماتے ہی کہ اس مسئلے میں اجماع ہے اور کچھ لوگ اس کا انکار کرتے ہیں۔ ہم جاننا یہ چاہتے ہیں کہ اجماع آخر کیا چیز ہے اور کیا قرآن و حدیث میں اس کا ذکر ہے؟

الجواب

"اجماع" فقہ کے چار دلائل میں سے تیسری بڑی دلیل ہے جس کا ثبوت کتاب اللہ سے بھی ہے اور سنت رسول سے بھی۔ عقلی دلائل بھی اس کے شاہد ہیں۔ "کسی امر شرعی پر ایک عصر کے مجتہدین امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والتحیۃ کے اتفاق کا نام اجماع ہے۔ یہ خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے امت محمدیہ کا اعزاز ہے کہ اس نے کسی امر دینی پر ان کے اجماع کو حجت شرعی قرار دیا اور رسول گرامی وقار ﷺ نے اس اجماع کو خطا سے معصوم و محفوظ ہونے کی سند عطا فرمائی۔ ارشاد باری ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا. (سورۃ النساء ۴، الآیۃ: ۱۱۵)

اور جو رسول کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت واضح ہو چکی ہے مومنوں کی راہ کے سوا راہ چلے تو ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ کیا ہی بری پلٹنے کی جگہ۔

اجماع بلاشبہہ "سبیل المؤمنین" یعنی مومنوں کی راہ ہے اور اس کے سوا راہ اپنانے پر جہنم کی وعید ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مومنین کی راہ پر چلنا لازم ہے تو ثابت ہوا کہ اجماع حجت ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضور سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لا تجتمع امتی علی الضلالۃ میری امت کا اجماع گمراہی پر نہیں ہوگا۔ اس مضمون کی حدیثیں اس کثرت سے مروی ہیں کہ ان کا مجموعہ اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے تواتر کی حد کو پہنچ جاتا ہے۔ تو اجماع بلاشبہہ حجت ہے۔

مسلم الثبوت میں ہے: امام ابو اسحاق اسفرائینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ اجماعی مسائل کی تعداد ہزار سے زیادہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

GPF کی زکات کب اور کیسے ادا کی جائے گی؟

گورنمنٹ ملازمین کا جو جی، پی، ایف، کا پیسہ کٹتا ہے، اس کی زکات کب اور کیسے ادا کی جائے؟

الجواب

اس میں دو صورتیں ہیں: اول فنڈ یعنی (G.P.F.) میں جو روپے حکومت تنخواہ سے ہر ماہ کاٹ، کاٹ کر جمع کرتی ہے، اس میں دو

طرح کے روپے شامل کرتی ہے۔ ایک وہ روپے جو اپنے ملازم کی تنخواہ سے کاٹ کر جمع کرتی ہے، یہ اصل رقم ہے۔ اور دوسرے وہ روپے جو حکومت اس پر اپنی طرف سے نفع کے طور پر شامل کرتی رہتی ہے۔ تو جو رقم تنخواہ سے کٹ کر جمع ہوئی، یا ہو رہی ہے، یا کوئی بونس ملا ہے، ایسی تمام رقوم پر سال بسال زکات واجب ہے۔ رہ گیا نفع کا مسئلہ تو جب نفع کی پوری رقم قبضے میں آجائے تو اُس سال کے مالِ نصاب کے ساتھ اسے جوڑ کر اس کی زکات دیں۔ یہاں یہ امر واضح رہے کہ نفع پر زکات کے وجوب و عدمِ وجوب کی بنیاد اس امر پر ہے کہ کھاتے میں اس کا اندراج شرعاً قبضہ ہے یا نہیں۔ اصل مذہب کی بنا پر تحقیق یہ ہے کہ وہ قبضہ نہیں ہے اس لیے قبضہ سے پہلے اس کی زکات واجب نہ ہوگی، لیکن حالات بدل رہے ہیں، لوگ اپنے طور پر اس اندراج کو ہی قبضہ کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے آگے چل کر حالات اس قدر بدل جائیں کہ عوام و خواص اس کے ساتھ قبضہ جیسا معاملہ کرنے لگیں تو اس وقت حکم بدل سکتا ہے، فی الحال حکم شرع یہی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کرایے کے روپے پر زکات کا مسئلہ

ہمارے پاس بہت سے کمرے ہیں جن کو ہم نے کرایہ پر دے رکھا ہے، تو کیا کمروں کی قیمت پر زکات دینی ہوگی یا پھر کرایے سے جو آمدنی ہوتی ہے اس پر زکات دینی ہوگی؟

الجواب

کمروں کی جو اصل قیمت ہے اس پر زکات قطعاً نہیں، بلکہ صرف اس سے حاصل ہونے والے کرایے کے روپے پر زکات فرض ہے۔
واللہ تعالیٰ اعلم

ہائی ڈپوزٹ پر زکات کا مسئلہ

ہائی ڈپوزٹ کا رواج ممبئی میں بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ جائز ہے یا ناجائز؟ کسی صاحب مکان کو لمبی رقم دے کر اس کا مکان لے لیتے ہیں پھر اسے کرایے پر دے کر نفع حاصل کرتے ہیں۔ جب اس کی دی ہوئی لمبی رقم اسے واپس ملتی ہے تو یہ اسے اس کا مکان واپس کر دیتا ہے۔ اس کو "ہائی ڈپوزٹ" کہا جاتا ہے۔ مزید عرض ہے کہ اس لمبی رقم کی زکات کس پر فرض ہے؟

الجواب

ہائی ڈپوزٹ کا یہ معاملہ در حقیقت قرض اور سود کا معاملہ ہے، وہ لمبی رقم جسے ہائی ڈپوزٹ کہا جاتا ہے شرعاً قرض ہے اور قرض دے کر مقروض کے مکان سے نفع حاصل کرنا سود ہے، حدیث میں ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا کہ حضور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں:

كلُّ قرضٍ جَرَّ نفعًا فهو ربٰو.
قرض کی وجہ سے جو نفع ملے وہ سود ہے۔ (مسند حارث)

مال قرض کی زکات قرض خواہ پر فرض ہوتی ہے اس لیے قرض دینے والا اس کی زکات ادا کرے۔ ساتھ ہی مقروض کے مکان سے اس نے جو نفع کمایا وہ بھی اسے واپس کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

نماز کی حالت میں موبائل بجنے پر کیا کریں؟

کسی کا موبائل چالو ہو اور عین حالت نماز میں موبائل بجنے لگے تو وہ کیا کرے؟

الجواب

نماز کے وقت میں اولاً تو موبائل آف کر دینے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ سائیلنٹ (Silent) میں کبھی کبھی تھرتھراہٹ (Vibrate) کی وجہ سے نمازی خود ہی خلل میں پڑ جاتا ہے، اور اس کا خشوع و خضوع درہم برہم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر بند کرنا بھول گیا اور دوران نماز موبائل بجنا شروع ہو گیا اور موبائل ایسا ہے کہ ایک ہی مرتبہ کوئی بٹن دبانے سے آواز بند ہو جائے گی تو بند کر دیں، کیوں کہ نماز میں عمل قلیل کی رخصت ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

ان كنت لا بد فاعلاً فواحدةً. (الصحيح لمسلم، كتاب الصلاة، باب كراهية مسح الحصىٰ و تسو ية التراب فى الصلاة، ج : ١ ص : ٢٠٦.)

اگر کرنا ضروری ہو تو ایک بار کر سکتے ہیں۔

اور اگر موبائل ایسا ہے کہ اس میں بہت سے بٹن ہیں اور وہ اتنا ماہر بھی نہیں کہ ایک بار ہی میں بند کر لے، بلکہ متعدّد بار اور کئی ایک بٹن دبانے کی ضرورت پیش آئے جس کی وجہ سے عمل کثیر میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہو، تو اس کو بجنے دے اور نماز پڑھے کہ عملِ کثیر سے نماز فاسد ہو جاتی ہے تو نماز کو فساد سے بچانے کے لیے کچھ خلل گوارا ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسلم پرسنل لا بورڈ مسلمانوں کا نمائندہ نہیں

صادق رضا مصباحی، ممبئی

"**اتحاد** زندگی ہے اور اختلاف موت" جیسے مقولے جتنے بولنے اور سننے میں اچھے لگتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ان کے عملی نفاذ میں رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جنہیں عبور کرنا بہت کم لوگوں کے بس کا ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ملک میں جتنی شدت سے اتحاد کی باتیں ہوتی رہی ہیں اور جس قدر اتحاد کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اسی شدت سے اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی ہے۔ اس کے پیچھے کوئی اور نہیں خود مسلمانوں کی نمائندہ سمجھے جانے والی جماعتیں اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بعض ذمے داران ہیں صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

پہلی یہ کہ تین طلاق کے مسئلے پر بورڈ نے سپریم کورٹ میں حلف نامہ داخل کر دیا ہے کہ اب مسلم کمیونٹی یک بارگی تین طلاق دینے والے کا سماجی بائیکاٹ کرے گی۔ بظاہر تو یہ بڑا اچھا فیصلہ معلوم ہوتا ہے، بہت سارے لوگ بورڈ کے اس اقدام کی ستائش بھی کر رہے ہیں مگر اس کے ہولناک نتائج پر بورڈ کی نظر نہیں گئی ہے۔ غلط نتائج کے خدشے کے پیش نظر اہل سنت کے علما نے بھی بورڈ کے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ ایک سیدھا سادھا مسلمان کس کی مانے اور کس کی نہ مانے۔ حکومت کے نزدیک بورڈ ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے، وہ تو اسی کی مانے گی، بورڈ سے الگ رہنے والوں کی کیوں کر مانے گی؟ نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں میں انتشار جوں کا توں باقی رہے گا، یہ کبھی ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہوں گے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ بورڈ کے ایک ذمے دار مولانا ولی رحمانی کہہ چکے ہیں کہ بورڈ کو تین طلاق کے مسئلے پر سپریم کورٹ کا فیصلے منظور ہوگا۔ ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا بورڈ کو وہ فیصلے بھی منظور ہوگا جو قرآن و سنت کے مخالف ہوگا؟ پتہ نہیں مولانا رحمانی کس خمار میں یہ بات کہہ گئے۔ بورڈ کو شاید اندازہ نہیں کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر حکومت کی آلۂ کار بن چکی ہے اور وہ وہی کہہ رہی ہے جو حکومت اس سے کہلوانا چاہتی ہے۔

اس تناظر میں کہنے کی بات صرف یہ ہے کہ بورڈ ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں ہے۔ ہاں اسے جزوی یا ضمنی طور پر وہ ہر مسلک کی نمائندہ ہو سکتی ہے کیوں کہ بورڈ نے سبھی مسالک کے لوگوں کو نمائندگی دی ہے مگر سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کو نمائندگی دی ہے کیا وہ اپنی جماعت میں اتنی اہمیت رکھتے ہیں؟ کیا انہیں اہم علمی استعداد حاصل ہے؟ کیا وہ کسی مسئلے کا گہری بصیرت کے ساتھ ادراک کرنے کے اہل ہیں؟ کیا ان کی ہر بات کو ان کی جماعت کے بڑے قبول کر لیں گے؟ اگر وہ اپنی جماعت کے نمائندہ نہیں ہیں تو انہیں بورڈ میں شامل کر کے یہ کیوں ثابت کیا جا رہا ہے کہ بورڈ تمام مسلمانوں کا نمائندہ ہے؟ یہاں سوال یہ بھی ہے کہ اگر اہل سنت کی اعلیٰ سطحی قیادت کو پرسنل لا بورڈ میں شمولیت کی دعوت دی جائے گی تو کیا وہ اسے آسانی سے قبول کر لیں گے؟ مگر اس سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا بورڈ کے ذمے داروں نے اہل سنت کی اعلیٰ سطحی قیادت کو بورڈ میں شامل ہونے کی دعوت دی ہے؟ در اصل بورڈ کو حقیقی نمائندگی دینی ہی نہیں، اسے صرف چہرے چاہیے جنہیں دکھا کر حکومت اور سیکولر حلقوں کی جانب سے بورڈ پر ہر مسلک کی مہر لگوائی جا سکے۔ یہی سوچ کر بورڈ نے اہل سنت کے تیسرے اور چوتھے درجے کے علما کو شامل کر لیا ہے تاکہ ببانگ دہل کہا جا سکے کہ ہم تمام فرقوں کے نمائندہ ہیں۔ اہل سنت کی کسی مستند اور اہم خانقاہ یا اہم ادارے کا کوئی بھی عالم دین اس بورڈ میں شامل نہیں۔

۱۹۷۲ میں ممبئی کے مہاراشٹر کالج کے میدان میں جب مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل ہوئی تھی اس وقت بلاشبہہ سبھی مسالک کے نمائندہ علما و مشائخ اس میں شامل تھے لیکن دھیرے دھیرے مسلک اہل سنت کے علما کٹتے چلے گئے اور دیگر مسالک کے علما کی بہتات ہوتی گئی۔ پھر بہت بعد میں اہل سنت کے چند ایسے چہروں کو نمائندگی دی گئی جن پر اہل سنت کی مقتدر شخصیتوں کو وہ اعتبار و اعتماد حاصل نہیں جو ہونا چاہیے۔ بہت سارے مسائل میں یہ حضرات خاموش رہتے ہیں، بورڈ کے اعلیٰ سطحی ذمے داران ہی بولتے ہیں اس لیے حکومت اور ہندوستانی عوام

یہی سمجھتے ہیں کہ بورڈ کاموقف ملک بھر کے مسلم نوں کا موقف ہے مگرواقعہ یہ ہے کہ مسلم نوں کے ایک بڑے حلقے میں بورڈ کے موقف کوکوئی اہمیت نہیں دی جاتی،وجہ وہی اعلیٰ سطحی نمائندگی نہ ہونا ہے ۔ سوچنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ جب آغاز میں سارے مسالک کے لوگ شامل تھے توبعد میں کچھ لوگ الگ کیوں ہوگئے ؟اصل میں یہ حضرات اقدامی پوزیشن کے بجائے دفاعی پوزیشن پر اتر آئے۔ عقائد و نظریات کے اختلافات کے باوجود ملی وسماجی مسائل کے حل کے لیے ان حضرات نے ایک پلیٹ فارم پر بیٹھنے کے نعرے توبہت لگائے مگر عملاً کچھ نہیں کیا جس طرح بورڈ کی تشکیل کے وقت علامہ ارشد القادری اور مولانامنت اللہ رحمانی نے کیاتھا۔یہ دونوں حضرات بریلی کے ایک عظیم المرتبت پیر طریقت کے حکم پرمسلم پرسنل لابورڈ کے اجلاس میں ممبئی آئے تھے۔

۱۹۷۲ءاور ۲۰۱۷ءمیں بہت نمایاں فرق ہے،نصف صدی ہونے کوہے ،چیزیں الٹ پلٹ ہو چکی ہیں ،دنیابہت آگے بڑھ چکی ہے نظریات میں ایسی تبدیلیاں آچکی ہیں کہ اس سے پہلے تاریخ نے کبھی نہیں دیکھی تھیں اور آج ملی مسائل کے اتحاد کے لیے جتنی ضرورت محسوس کی جارہی ہے،اتنی پہلے نہیں تھی مگراب بھی مسالک کے درمیان دوریاں ہیں ۔اس تناظر میں مجھے نہیں لگتاکہ اتحادکی راہیں کبھی ہموار ہوسکیں گی،اوراس کے پیچھے جتناذمے دار بورڈ ہے اتنی ہی ذمے داراہل سنت کی اعلیٰ سطحی قیادت بھی ہے ۔ بورڈاس لیے کہ اسے میڈیااور حکومت کو دکھانے کے لیے صرف چہرے چاہیے تھے ،سووہ اس نے شامل کر لیے ہیں ،اسے صرف ایسے چہرے چاہیے جواس کی ہربات پر آمنا وصدقنا کہتے رہیں ،جوچوں وچراں کی جراءت نہ کرسکیں ،ظاہر ہے کہ کوئی بھی بڑاعالم اوراپنی جماعت کاحقیقی نمائندہ ہربات کویوں ہی تونہیں تسلیم کرلے گا۔شاید یہی وجہ ہے کہ بالقصد اعلیٰ سطحی علمی وروحانی قیادت کونمائندگی نہیں دی جارہی ہے ۔اور اہل سنت کی اعلیٰ سطحی قیادت اس لیے ذمے دار ہے کہ وہ اس خیال سے کبھی باہر ہی نہیں نکلتی کہ وہی حق پر ہیں اس لیے انہیں کوئی ضرورت نہیں دوسروں کے ساتھ شامل ہونے کی،وہ حق پر ہیں اس لیے وہ اپنے حساب سے کام کریں گے چاہے کتنے ہی طوفان سر سے گزر جائیں ،ملتیں لٹ جائیں، مسلم ن بنام مسلم کاٹ کر پھینک دیے جائیں،ان کے ملی حقوق پرڈاکے ڈالے جاتے رہیں مگروہ وہی کریں گے جووہ چاہیں گے اور جسے وہ ’حق‘ سمجھیں گے۔

اہل سنت کی نمائندگی کے لیے مولاناتوقیر رضابریلوی نے آل انڈیامسلم پرسنل لابورڈ جدید ۲۰۰۲میں بنایاتھا۔ظاہر ہے، پرانے بورڈ کی موجودگی میں اسے کیوں اہمیت دی جاتی اورحکومت وعوام میں اسے کیوں کر قبول عام حاصل ہوتا اسی لیے وہ چند ہی دن چل سکااور پھر بیٹھ گیا۔

ملک کے دردمند عوام اپنے مسائل کاحل چاہتے ہیں،وہ حالات سے بالکل بیزار ہوچکے ہیں ۔ خاص طور پر نوجوان پڑھی لکھی نسل ان حالات سے ایسی مایوس ہے کہ وہ سیدھا علماومشائخ کوہی نشانہ بناتی ہے ،اوراس بناپر علماومشائخ ان پر بے روک ٹوک الحاداور دہریت کاالزام لگاکر مطمئن ہو جاتے ہیں ۔ مجھے جیساطفل مکتب انہیں یہ سمجھانے کی جراءت کیسے کرے کہ یہ الحادنہیں اضطراب ہے ، اور اگر یہی حالت رہی تو یہ اضطراب بہت جلد الحادمیں بدل جائے گا۔ایک بات یادرکھیے کہ حکومت تین طلاق کاحل نہیں چاہتی وہ دراصل اس راستے سے مسلم نوں میں تفریق کابیج بورہی ہے اوراس کے ذریعے ہندوئوں کو متحد کرنے میں کوشاں ہے۔بظاہر توحکومت نے گیند سپریم کورٹ کے پالے میں ڈال دی ہے ، سپریم کورٹ نے بھی اپنا فیصلے محفوظ کرلیاہے مگر خفیہ ایجنسیوں نے حکومت کواچھی طرح بتادیاہے کہ مسلم ن کبھی ایک ہونے والے نہیں ،ان کے درمیان کچھ واقعی اختلاف ہیں اور کچھ ایسے افراد بھی ہیں جواپنی ڈیڑھ کی مسجد ہر حال میں الگ بناناہی چاہتے ہیں اس لیے ان کے درمیان پھوٹ پڑی ہی رہے گی اس لیے وقت وقت پر ایسے مسائل اٹھائے جانے چاہیے تاکہ یہ قوم بس اسی میں الجھی رہے ۔ہم مسلم ن عام طور سیاسی لیڈروں اور حکومتوں کی اپنی زبوں حالی کاذمے دار قرار دیتے ہیں لیکن اگر گہرائی سے تجزیہ کیاجائے تواس کے ذمے دار ہم خود ہیں ، حکومتیں اور سیاسی لیڈران توبس ہوا دیتے ہیں جس سے دبی ہوئی چنگاری ابھر آتی ہے اس لیے ہمیں اپنے احوال کے لیے حکومت سے شکوہ نہ کرکے اپنی قیادت سے سوال کرناچاہیے اور ذمے دار حکومت کو نہیں خود کوٹھہراناچاہیے۔بس احساس پیدا کر لیجیے کہ احساس نہیں توکچھ بھی نہیں ،احساس نہیں توزندگی نہیں ،احساس کے بغیر زندگی راکھ کاڈھیر ہے۔ *****

=================

بھاگل پور(بہار) میں

ماہنامہ اشرفیہ حاصل کریں

مولانامحمداحمدرضاعزیزی

امام مسجد حبیب پور،ضلع بھاگل پور، بہار

لباس کا بنیادی مقصد

حافظ محمد ہاشم قادری مصباحی

اللہ رب العالمین نے تمام بنی نوع انسان (بلا امتیاز مذہب وعقیدہ) کو لباس پہننے کا حکم دیا اور لباس پہننے کے لیے بنیادی اور ضروری اصول بھی بتائے۔ ان طریقوں کی رعایت رکھنا ضروری ہے۔ تاریخ اس بات پر متفق ہے کہ انسانی شعور نے ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے شرم وحیا کے فطری تقاضے کی تکمیل کی اور عریانی (ننگے پن) کے احساس سے پریشان ہوکر اپنے جسم کو چھپانے کے مختلف طریقے اپنائے۔ جنگلیوں نے پتوں سے اپنی شرم گاہوں کو چھپایا۔ آج ترقی یافتہ کہے جانے والے دور میں بھی ستر پوشی کی ضرورت پوری کرنے والی مختلف چیزوں کو شعور انسانی نے لباس کا نام دیا۔ یہی لباس انسانی زندگی کی اہم ضرورت ہے کیونکہ لباس سے جسم کی پردہ پوشی، زیب وزینت کے ساتھ ساتھ موسمی اثرات، سردی گرمی وغیرہ سے انسانی جسم کی حفاظت اور ماحول کے اثرات وبیماری کے جراثیم سے خود کو بچانا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِیْشًا وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَیْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ (سورہ الاعراف، آیت ۲۶)

ترجمہ: اے اولاد آدم بے شک ہم نے تمہاری طرف لباس اتارا تاکہ تم سب اپنی شرم گاہوں کو چھپاؤ اور لباس سے آرائش، زیب وزینت حاصل کرو۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ نصیحت مانیں (کنزالایمان)۔

معلوم ہوا کہ ستر کا لباس فرض ہے اور لباس زینت مستحب ہے۔ رب العالمین نے تین طرح کے لباس اتارے۔ دو جسمانی ایک روحانی۔ امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے عمدہ لباس کے علاوہ زیب وزینت کی تمام اشیا کو اس آیت میں داخل فرمایا ہے خواہ ان کا تعلق لباس کی نفاست، جسم کی نظافت، گھر کی صفائی وآرائش سے ہو، بشرطیکہ شریعت نے انہیں حرام نہ کیا ہو اور فضول خرچی نہ ہو۔ علامہ آلوسی بغدادی علیہ الرحمۃ بھی یہی نکتہ بیان فرماتے ہیں۔

سورہ اعراف کی آیت مبارکہ ۱۹ نمبر سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیطان کے بہکاوے کا شکار ہونے پر حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو اپنی عریانی کا احساس ہوا اور وہ درخت کے پتوں سے اپنے ستر کو چھپانے لگے۔ عیسائیوں کی مقدس کتاب بائبل کے عہد نامہ قدیم کے پہلے عنوان پیدائش کے باب (ب ۳) میں آدم اور ان کی خاتون کو ہونے والے احساسِ عریانی اور درخت کے پتوں کے لباس کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

لباس کے بارے میں قرآن میں متعدّد جگہ تفصیل کے ساتھ ذکر موجود ہے۔ لباس کا اہم مقصد یہ ہے کہ ستر (شرم کی جگہوں) کے حصوں کو چھپائے۔ جو لباس اس مقصد کو پورا نہ کرے سرے سے وہ لباس ہی نہیں ہے کیونکہ وہ لباس اپنا بنیادی مقصد پورا نہیں کر رہا ہے جس کے لیے وہ سلایا، بنایا گیا ہے۔ یہی لباس انسان اور باقی تمام مخلوق وجانوروں میں فرق ظاہر کرنے کا پہلا اور آخری ذریعہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مہذب جنگلی انسان جو غاروں، جنگلوں میں رہا کرتے تھے وہ بھی کپڑا میسر نہ ہونے کے باوجود اپنے ستر کو ڈھانپنے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ آجکل کا ننگا پہناوا موجودہ دور کے فیشن نے لباس کے اصل مقصد ہی کو مجروح کر دیا ہے۔

آجکل مردوں اور عورتوں میں ایسے لباس رائج ہوگئے ہیں جس میں اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ جسم کا کون سا حصہ کھلا ہوا ہے اور کون سا ڈھکا ہوا ہے۔ حالانکہ اسلام میں ستر کا حکم یہ ہے کہ مرد کے لیے مرد کے سامنے ستر کھولنا جائز نہیں اور عورت کے سامنے عورت کو ستر کھولنا جائز نہیں۔ مثلاً اگر کسی عورت نے ایسا لباس پہنا ہے جس سے سینہ کھلا ہوا ہے، پیٹ کھلا ہوا ہے، بازو کھلے ہوئے ہیں تو اس عورت کو اس حالت میں دوسری عورتوں کے سامنے آنا بھی جائز نہیں چہ جائیکہ اس حالت میں مردوں کے

سامنے آئے۔ اس لیے کہ یہ اعضا اس کے ستر کے حصے ہیں ۔ آجکل شادی وغیرہ کی تقریبات میں دیکھیے کیا حال ہورہا ہے۔ بے باکی، بے حیائی کے ساتھ عورتیں ایسے لباس پہن کر گھومتی پھرتی ہیں۔ مذہب سے دور ،اسلام بیزار ذہنیت لوگ کہتے پھرتے ہیں ،صاحب اس ظاہری لباس میں کیا رکھا ہے۔ اسلام اس کی نفی کرتا ہے۔

لباس میں پاکی وصفائی وقار اور متانت ضروری ہے:

لباس انسانی وقار وشرافت کی پہچان ہے ۔ اس سے انسان کی عزت ووقار کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اسلام نے لباس کے ذریعہ خوبصورتی حاصل کرنے ہی پر زور نہیں دیا ہے بلکہ نماز جیسی اہم عبادت کے لیے بھی حکم دیا کہ مسجد جاؤ تو بھی صاف ستھرا ہوکر خوب زیب و زینت کرکے جاؤ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا۔ الخ (سورہ اعراف، آیت:۳۰)

ترجمہ: اے اولاد آدم اپنی زینت کرلو (کپڑے پہن لو) جب مسجد میں جاؤ اور خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ بڑھو۔ بے شک حد سے بڑھنے والے کو اللہ پسند نہیں کرتا۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جہاں تک ہوسکے نماز اچھے لباس میں پڑھے، مسجد میں اچھی حالت میں آئے، بدبودار اور گندے کپڑے میں مسجد میں نہ آئے اور ننگا مسجد میں نہ آئے، داخل نہ ہو۔ اور اسے انسانی طریقہ بھی کہا جاتا ہے (کفار و مشرکین خانہ کعبہ میں ننگے طواف کرتے تھے)۔ اسلام نے اس سے منع فرمایا۔ بے شرمی و بے حیائی روز اول سے انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ انسانی فطرت میں شرم و حیا روز اول سے داخل ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کے واقعہ سے ملتا ہے۔ جب حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی وجہ سے وہ بے ستر ہوگئے تو انہیں شرم محسوس ہوئی۔ فوراً جنت کے درخت سے پتوں کو توڑ کر اپنی شرم کی جگہوں کو ڈھانپ لیا۔ اسلام کبھی بھی ادھ ننگے پن یا عریانیت کی اجازت نہیں دیتا۔ دین اسلام جہاں دوسری برائیوں کو دور کرنے پر زور دیتا ہے وہیں لباس کے معاملے میں شائستگی ، وقار، نفاست، خوبصورتی کی تعلیم دیتا ہے۔ واضح رہے کہ خوبصورتی بدن ڈھانپنے کے معنی میں ہے نہ کہ کپڑوں کے نام پر بدن پر صرف پٹی ڈالنا خوبصورتی نہیں بے حیائی و بے شرمی ہے۔ آج آزادی و فیشن کے نام پر عوامی مقامات پر، اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور طرح طرح کی تقاریب میں عریانیت کا کھلے عام مظاہرہ کیا جارہا ہے۔ یہ انتہائی شرم ناک اور افسوس ناک ہے ۔ جوان لڑکیوں کے جسم پر ٹی شرٹ، جینس، بلاؤز کے نام پر بیک سائیڈ پیٹھ پر صرف ایک پٹی اور اسکرٹ جیسے کپڑے پہننے کے باوجود عورت بے لباس نظر آتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ لڑکے عموماً پورے کپڑے پہنتے ہیں جبکہ لڑکیاں اور عورتیں کھلے عام نامکمل مختصر اور کم کپڑے پہنتی ہیں۔ آج کے اس دور میں اخبارات، ٹی وی کی ہیڈ لائن میں ۳۷٪ قریب زناکاری، بدکاری، ریپ کیس کی ہوتی ہیں۔ (این ڈی ٹی وی انڈیا سروے: رویش کمار)۔

اسلام نے ان چیزوں (بدکاری اور بد نگاہی) پر سخت پابندی لگائی ہے۔

اسباب زنا میں لباس کا حصہ:

آوارگی، بے حیائی جو کہ زنا، ریپ کیس کی پہلی سیڑھی ہے اس کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے اسلام نے نگاہ کی حفاظت کا سخت حکم صادر فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ.

(سورہ نور، آیت :۳۰)

ترجمہ: مسلمان مردوں کو حکم دو اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں ۔ یہ ان کے لیے بہت ستھرا ہے بے شک اللہ کو ان کے کاموں کی خبر ہے۔

آج بازاروں میں ،تفریح گاہوں میں بنت حوا اپنے تنگ اور کم کپڑوں میں کھلے عام عریانیت کا مظاہرہ کررہی ہیں۔ افسوس اس بات پر ہے کہ ایسے شرم ناک کپڑے پہن کر بچیاں اپنے والدین کے ساتھ اور عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ گھومتی نظر آرہی ہیں جو فتنہ وفساد کا سبب بنتے ہیں۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اسلام اس کے تعلق سے بہت حساس ہے۔ اس کی تعلیمات پیش بندی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی بد نگاہی سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ۔ (سورہ نور، آیت :۳۱)

ترجمہ: اور مسلمان عورتوں کو حکم دو کہ اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں

اور پارسائی کی حفاظت کریں۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ مردوں اور عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ نگاہوں کے نیچی رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ صنف نازک کی عریانیت اور بناؤ سنگار کا صنف مخالف پر اثر نہ پڑے اور سامنے والی کی عریانیت سے آنکھ و دل بھی متاثر نہ ہو اور جب یہ دونوں چیزیں متاثر نہیں ہوں گی تو دست درازی اور زناکاری کا بد ترین عمل بھی نہیں ہوگا۔ پیارے نبی ﷺ کا فرمان عالیشان ہے کہ اگر کسی خاتون پر اچانک نظر پڑ جائے تو فوراً نگاہ پھیر لو۔ دوسری حدیث حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے ارشاد فرمایا: اے علی! اجنبی عورت پر اچانک نظر پڑ جائے تو فوراً نگاہ پھیر لو، دوسری نگاہ اس پر نہ ڈالو، پہلی نگاہ معاف ہے لیکن دوسری نگاہ پر مواخذہ ہے۔ ہمارے آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ عزوجل اس قوم کی دعا قبول نہیں کرتا جس کی عورتیں جھاجھنی پہنتی ہیں۔ (ابوداؤد، ترمذی)

ہم سب کو انتہائی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ جب زیور کی آواز دعا نہ قبول ہونے کا سبب ہے تو خود عورت کی آواز اور اس کی بے پردگی کتنی تباہی کا باعث ہو سکتی ہے۔ اسلام کبھی بھی عریانی اور کم لباسی کی اجازت نہیں دیتا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں:

زینت بناؤ سنگار کی چیزوں میں لباس بھی داخل ہے اور زیورات بھی۔ اس میں نہ تو ہر چیز کا چھپانا ممکن ہے اور نہ ہی ہر چیز کا اظہار ناگزیر ہے۔ لباس کے استعمال میں اس احتیاط کی سخت ضرورت ہے کہ لباس ایسا نہ پہنا جائے جو ستر پوشی کے مقصد کو پورا نہ کرے اور ایسی زیب و زینت نہ اختیار کرے کہ جذبات بھڑک جائیں اور اس میں تکبر و غرور نہ شامل ہو۔ حدیث پاک میں حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دنیا میں شہرت و ناموری کے لیے کپڑے پہنے گا اللہ اسے قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنائے گا۔

(سنن ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب من لبس شہرۃ من الثیاب)

احادیث میں اور کلام الٰہی میں لباس کا اصل مقصد جسم کے ان حصوں کو چھپانا ہے جو شرم کی جگہ ہیں، فرض عین ہے۔ حالات و موسم کے لحاظ سے جسم کی حفاظت اور زیب و زینت کے ساتھ ساتھ لباس میں وقار، متانت، شائستگی ہر حال میں مطلوب ہے۔ ان باتوں کی مزید وضاحت ان احادیث سے ہوتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دو قسم کے لباس سے منع فرمایا۔ ایک اشتمال الصماء اور دوسرے احتباء۔ اشتمال الصماء سے مراد ایسا لباس جو بالکل بدن پر ایسا لپٹا ہو کہ کوئی عضو بغیر تکلیف کے حرکت نہ کر سکے۔ احتباء کا مفہوم یہ ہے کہ ایک کپڑے کو بدن پر ایسے لپیٹنا کہ ستر کھلا رہے (پورا نہ ڈھکے)۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب ماینہی عنہ من اللباس)

ان احادیث میں جن کپڑوں کے استعمال کی ممانعت کی گئی ہے ان کا تعلق مردوں اور عورتوں دونوں سے ہے۔ موجودہ دور کے جدید فیشن میں جس قسم کے لباس کا استعمال ہوتا ہے اس سے ان کپڑوں کی نوعیت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جن کی ممانعت اس احادیث میں کی گئی ہے اور ان کی وجہ سے سماج میں جو خرابیاں و برائیاں پیدا ہوتی ہیں وہ دنیا دیکھ رہی ہے۔ آج ادھ ننگا لباس بھی سبب زنا بنا ہوا ہے۔ اسلام نے ہر برے کام پر روک لگائی ہے۔ اسباب زنا پر قرآن نے سخت پابندی کا اعلان کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيْلًا.

(سورہ بنی اسرائیل، آیت: ۳۲)

ترجمہ: اور بدکاری کے پاس نہ جاؤ بیشک وہ بے حیائی ہے اور بہت ہی بری راہ ہے۔

اس آیت مبارکہ میں رب تعالیٰ نے زنا سے روکا ہے بلکہ زناکاری کے اسباب سے بھی سختی سے منع فرمایا۔ زناکاری کے اسباب میں آجکل سوشل میڈیا، واٹس ایپ، یوسی بروزر، یوٹیوب، انٹرنیٹ، انڈرائیڈ موبائیل (ہی بے پردگی اور بد نگاہی) وغیرہ وغیرہ کا بڑا حصہ ہے۔ اسلام اس طرح کی چیزوں سے منع فرماتا ہے اور یہ حکم مردوں اور عورتوں دونوں کو دیا گیا ہے۔ ایک خاص قسم کے لباس، تنگ لباس، باریک لباس وغیرہ انتہائی شرمناک اور افسوس ناک ہے۔

ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے:

بہت سی لباس پہننے والی عورتیں بے لباس، عریاں ہوتی ہیں۔

اس حدیث پاک نے انتہائی باریک لباس کی خرابی و برائی نہایت اچھے انداز میں بتا دیا۔ اللہ ہم تمام مسلمانوں کو لباس کے احکام جاننے اور شریعت کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ثم آمین!!

☆☆☆☆☆

فقہ وتصوف کا باہمی امتزاج

محمد طفیل احمد مصباحی

علوم وفنون کی تقسیم کرتے وقت عام طور سے علوم نقلیہ و علوم عقلیہ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ علوم نقلیہ کے ضمن میں علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ وغیرہ آتے ہیں۔ جب کہ علوم عقلیہ میں منطق و فلسفہ، علم ریاضی و دیگر سائنسی علوم آتے ہیں۔ "العلم حجاب اللہ الاکبر" علم، اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ اس لیے ہر وہ علم جس سے معرفت الٰہی اور تقرب الٰہی اللہ کا بلند مقام حاصل ہو۔ درحقیقت وہی دینی علم ہے، خواہ اس کا تعلق علوم عقلیہ سے ہو یا علوم نقلیہ سے۔

یہاں راقم الحروف کا علوم کی تقسیم سے مقصد فقہ و تصوّف کی دینی و شرعی حیثیت متعین کرنا ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ علم تفسیر اور علم حدیث کی طرح علم فقہ اور علم تصوف بھی "دینی علوم" کے اقسام میں سے ہیں۔

ڈاکٹر فیض احمد چشتی اپنے مضمون "مقصد کے اعتبار سے علوم کی تقسیم" میں لکھتے ہیں:

جب یہ بنیادی بات طے پا گئی کہ ہر وہ علم جس سے معرفتِ الٰہی میسر آئے اور قرب الٰہی نصیب ہو، صحیح معنوں میں وہی علم ہے، تو اس اعتبار سے جب ہم علوم کی تقسیم کریں گے تو صرف علم القرآن، علم التفسیر، علم الحدیث، علم الفقہ، علم النحو، علم الصرف اور علم التصوّف وغیرہ ہی "دینی علوم" نہیں ٹھہریں گے۔ بلکہ حیاتیات، طبیعیات، نفسیات، کیمیا، سیاسیات، عمرانیات، معاشیات، تاریخ، قانون، نیوکلیئر ٹیکنالوجی، کمپیوٹر سائنس، انتظامیات، تجارت اور ابلاغیات کے علوم بھی "دینی علوم" کے زمرے میں شمار ہوں گے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ان علوم کے حصول کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا ہو اور یہ علوم معرفت الٰہیہ اور قربِ الٰہیہ کا ذریعہ بنیں۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو اپنے علم کے حصول کا آغاز اللہ تعالیٰ کے نام سے کرے اور اس کا مقصد اس علم سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہو تو وہ دنیا کے کسی بھی خطّے، کسی بھی شعبے میں علم حاصل کرے، وہ دین الٰہیہ اور علم دین کا طالب علم ہی کہلائے گا۔ کیوں کہ ان تمام علوم کا ہر گوشہ کسی نہ کسی اعتبار سے اپنے دامن میں خدا کی معرفت کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور رکھتا ہے۔

علم تصوف کو غیر اسلامی یا جوگیوں اور پنڈتوں کا علم کہنا، سراسر زیادتی اور روحِ تصوف سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ علم تصوف، اسلامی علوم اور دینی فنون کا ایک معتبر اور اہم حصّہ ہے۔ اسلامی تعلیمات کے فروغ و استحکام میں علم تصوف اور صوفیۂ کرام کی گراں قدر خدمات اسلامی تاریخ کے روشن ابواب ہیں۔

علوم شریعت و طریقت کے رمز آشنا حضرت امام غزالی علیہ الرحمۃ نے اپنی مایۂ ناز کتاب "المستصفیٰ" میں اوّلاً علوم کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں: (۱) علوم عقلیہ (۲) علوم دینیہ۔ علوم عقلیہ میں طب، حساب، ہندسہ وغیرہ کو شمار کرتے ہوئے علوم دینیہ کے ضمن میں علم کلام، علم فقہ، اصول فقہ، علم حدیث، علم تفسیر، علم باطن یعنی علم تصوف کا ذکر کیا ہے۔

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

إعلم ان العلوم تنقسم إلی عقلیه: کالطب، والحساب، والهندسه، والیٰ دینیة، کالکلام، والفقه، وأصوله، وعلم الحدیث، وعلم التفسیر، وعلم الباطن، اعنی علم القلب وتطهیره عن الأخلاق الذمیمة. (المستصفیٰ فی علم الأصول، ص:٦، دار الکتب العلمیه، بیروت)

فقہ وتصوّف کا بنیادی ماخذ:

قرآن مقدس کی صراحت کے مطابق نبوت و رسالت کے فرائض و خصوصیات میں سے ایک اہم فریضہ بندگانِ خدا کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینا، ان کے قلوب کو مصفّٰی و مزکّٰی کرنا اور انھیں تصفیہ و تزکیہ کے زیور سے آراستہ کرنا ہے، تاکہ انسان "تحلّی بالفضائل و تخلّی عن الرّذائل" کا مجسّمہ بن کر اپنے مقصد تخلیق کو پا سکے اور دارین کی ابدی سعادتوں سے مالامال ہو سکے۔

ارشادِ خداوندی ہے: **هو الذی بعث فی الامّیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین.**

(قرآن کریم، سورہ جمعہ، آیت:۲)

مفسرین کرام اور فقہا و محدثین کی وضاحت کے مطابق اس آیت کریمہ میں "تزکیہ" سے "سلوک و تصوّف" مراد ہے۔ انسانی نفوس کو عمدہ اخلاق، پاکیزہ عادات اور بلند کردار سے آراستہ کرکے، ان کے قلوب کو رذائل اور معاصی کے سیاہ دھبّوں سے پاک و صاف کرنے کو، شریعت اور تصوف کی اصطلاح میں "تزکیہ" کہتے ہیں۔

موجودہ تصوف کا قرآنی نام "تزکیہ" ہے اور حدیث پاک میں اس

تصوّف کو "احسان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث، جس کو "حدیث جبرئیل" بھی کہتے ہیں، اس میں "احسان" کا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے:

"قال: ما الإحسان؟ قال: أن تعبد الله كانك تراه، فإن لم تكن تراه، فإنه يراك۔(بخاری شریف، کتاب الإیمان، حدیث: ۵۰، دار ابن کثیر، بیروت)

یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اللہ کے رسول ﷺ سے پوچھا کہ "احسان" کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو، جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اور اگر تم سے یہ نہ ہو سکے تو یہ خیال کرو کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے۔

محقق علی الاطلاق حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی اس حدیث پاک کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جان لو کہ دین اور اس کے کمال کی بنیاد فقہ، کلام اور تصوف پر ہے۔ اس حدیث نے ان تینوں مقاموں کا بیان کر دیا۔ اسلام سے اشارہ فقہ کی طرف ہے جو اعمال و احکام شرعیہ کے بیان کا متکفل ہے اور ایمان، سے اشارہ اعتقادات کی طرف ہے جو کہ علم اصول (کلام) کے مسائل ہیں اور احسان سے اشارہ اصل تصوف کی طرف ہے۔ جس سے مراد خدا کی طرف صدق دل سے توجہ ہے۔ تصوف کے تمام معانی جن کی طرف تمام مشائخ طریقت نے اشارہ کیا ہے اسی معنی کی طرف راجع ہیں۔ فقہ، کلام اور تصوف لازم و ملزوم ہیں کہ ایک دوسرے کے بغیر ان میں سے کوئی کامل نہیں ہوتا۔ کیوں کہ فقہ بغیر تصوف کے اور تصوف بغیر فقہ کے صورت پذیر نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ کلام الٰہیہ بغیر فقہ کے پہچانا نہیں جاتا اور فقہ بغیر تصوف کے کامل نہیں ہوتا۔ کیوں کہ عمل بغیر صدق توجہ کے تمام و کامل نہیں ہوتا اور یہ دونوں بغیر ایمان کے صحیح نہیں ہوتے۔ جس طرح کہ روح و جسم ایک دوسرے کے بغیر وجود و کمال اختیار نہیں کرتے۔ اسی واسطے امام مالک نے فرمایا "جو شخص صوفی بنا اور فقیہ نہ ہوا وہ زندیق ہو گیا، اور جو فقیہ بنا اور صوفی نہ ہوا، وہ فاسق ہو گیا اور جو دونوں کا جامع ہوا، وہ بے شک محقق بن گیا، کمال جامعیت یہی ہے

(روح تصوف، ص:۴۱، ۴۲، امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی)

مندرجہ بالا اقتباس سے فقہ و تصوف کے باہمی امتزاج پہ بھرپور روشنی پڑتی ہے اور روز روشن کی طرح یہ حقیقت بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ تصوف نہ عجمی خیالات کا مجموعہ ہے اور نہ ہندوانہ مراسم کا نچوڑ، بلکہ تصوف، شریعت اسلامی سے ماخوذ ایک اہم علمی و روحانی علم ہے، جس کے نظائر و امثال کتاب و سنت میں موجود ہیں اور جس کی تعلیمات دین و شریعت کی تعلیمات کے عین مطابق ہیں۔

تصوف کا بنیادی ماخذ قرآن و حدیث ہے۔ قرآن مقدس اور احادیث طیبہ میں جن احکام و تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم دی گئی ہے، تصوف کے مسائل و مباحث اس دائرے سے باہر نہیں ہیں۔ حدیث کی کتابوں میں "کتاب الزھد و الرقاق" کا مطالعہ کرنے والا اس حقیقت کا برملا اعتراف کرے گا کہ تصوف کے مسائل و موضوعات بعینہ وہی ہیں، جو احادیث کی کتابوں میں "زہد و رقاق" کے تحت بیان کیے جاتے ہیں۔

حضرت مجدّد الف ثانی شیخ سرہندی علیہ الرحمہ تصوف کو دینی و شرعی علوم کا ایک حصہ قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"شریعت کے اندر جن اعمال کے کرنے اور جن کے نہ کرنے کا حکم ہے وہ دو قسم کے ہیں: بعض کا تعلق ظاہر بدن یا ظاہری چیزوں سے ہے۔ جیسے کلمہ پڑھنا، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ، والدین کی خدمت وغیرہم۔ ان کو مامورات کہتے ہیں اور کلمات کفر کہنا، شرک کے افعال کرنا، زنا، چوری، سود، رشوت، وغیرہ ان کو منہیات کہتے ہیں۔ بعض اعمال ایسے ہیں جن کا تعلق باطن سے ہے، جیسے ایمان و تصدیق، عقائد حقہ، صبر و شکر، توکل و رضا، اخلاص، محبت خدا و رسول۔ ان کو مامورات و فضائل کہتے ہیں اور عقائد باطلہ، بے صبری، ناشکری، ریا و عُجب، تکبّر، یہ مناہی و رذائل ہیں۔ جس طرح قرآن میں اقیمو الصلوٰۃ اور آتوا الزکوٰۃ موجود ہے۔ اسی طرح یاایّھا الذین آمنوا، اصبرو اور واشکر و اللہ بھی موجود ہے۔ اگر ایک مقام پر کُتب علیکم الصیام. اور. وللہ. علی الناس. حج البیت پاؤ گے تو دوسرے مقام میں یحبّھم و یحبونہ اور و الذین آمنوا اشد حبا اللہ بھی پاؤ گے جہاں قاموا الیٰ الصلوٰۃ قاموا کسالیٰ ہے، اس کے ساتھ یراؤن الناس بھی ہے۔ اگر ایک مقام پر تارکِ نماز و زکوٰۃ کی مذمت ہے تو دوسرے مقام پر تکبّر و عجب کی برائی بھی ہے۔ اسی طرح احادیث کو دیکھو جس طرح ان میں ابواب نماز، روزہ، بیع و شرا اور نکاح و طلاق پاؤ گے، اسی طرح ابواب ریا و کبر کو بھی دیکھو گے۔ اس بات سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے کہ جس طرح اعمال ظاہرہ حکم خداوندی ہیں، اسی طرح اعمال باطنہ بھی حکم الٰہیہ ہیں۔ کیا اقیموا. الصلوٰۃ و اٰتو الزکوٰۃ. امر کا صیغہ ہے تو اصبروا و اشکروا امر کا صیغہ نہیں؟ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ظاہر احکام سب ہی باطن کی اصلاح کے لیے ہیں۔

(روح تصوف، ص:۴۳-۴۲، امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی)

شریعت و طریقت کے دو مسلما الثبوت امام کے مندرجہ بالا اقتباس سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ فقہ و تصوف کے بنیادی ماخذ قرآن و حدیث ہیں۔ اور فقہ و تصوف میں بڑا گہرا ربط ہے اور یہ باہمی ربط و تعلق اتنا شدید ہے کہ فقہ کے

بغیر تصوف اور تصوف کے بغیر فقہ کامل واکمل نہیں ہوتا۔

فقہ وتصوف کے درمیان ربط وتعلق:

شیخ ابوالعباس احمد زروق فاسی لکھتے ہیں:

والفقه والتصوف شقيقان فى الدلالة على أحكام الله و حقوقه۔ (قواعد التصوف، ص:۲۹، بیروت)

یعنی احکام الٰہیہ اور حقوق اللہ پر دلالت کرنے کے سبب فقہ وتصوف ایک دوسرے کے مثل ہیں۔

فقہ وتصوف میں اس لحاظ سے بھی ربط وتعلق ہے کہ فقہ، احکامِ شرع جاننے کا نام ہے اور تصوف، احکامِ شرع کو روز مرّہ زندگی میں عملاً نافذ کرنے کا نام ہے۔ صوفیۂ کرام جو احکامِ شرع کے ظاہر شناس اور باطنی احوال وکیفیات کے رمز آشنا ہوتے ہیں اور ظاہری وباطنی احکام پہ یکساں عمل پیرا ہوتے اور دوسروں کو ان کی ترغیب دیتے ہیں، وہ خود پہلے علم فقہ حاصل کرتے ہیں، اس کے بعد فقہِ باطن یعنی سلوک وتصوف کے میدان میں قدم رکھتے ہیں اور فقہ کی روشنی میں ہی طریقت وتصوف کے دشوار گذار مراحل طے کرتے ہیں۔ اگر تصوف، شریعت یا فقہ سے علاحدہ کوئی فن یا نظریہ ہوتا تو صوفیۂ کرام تصوف کے لیے شریعت یا علم فقہ کے حصول کو لازمی قرار نہ دیتے۔ تصوف کے لیے فقہ کا حصول اور شریعت کی اتباع بنیادی شرط ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ فقہ وتصوف میں بڑا گہرا ربط ہے۔ دونوں میں کسی قسم کی مغائرت یا مخالفت نہیں ہے۔

شیخ محقق عبدالمجید خیالی کا یہ خیال مبنی بر حقیقت ہے کہ:

لا تصوف إلّا بفقه و لا فقه إلّا بتصوف.

(قواعد التصوف، ص:۲۹، بیروت)

یعنی فقہ کے بغیر تصوف اور تصوف کے بغیر فقہ کا کوئی وجود نہیں۔ دونوں ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔ جہاں فقہ ہوگا، وہاں تصوف بھی ہوگا اور جہاں تصوف ہوگا، وہاں فقہ کی چاندنی بھی اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہوگی۔

تصوف کی کتابوں میں صوفیۂ کرام کا یہ تاکیدی جملہ واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ: عالم صوفی بنو، صوفی عالم نہ بنو۔ یعنی پہلے علمِ فقہ اور علمِ شریعت حاصل کرو۔ اس کے بعد علمِ تصوف کی طرف توجہ دو۔ علمِ فقہ حاصل کیے بغیر جادۂ تصوف میں قدم رکھنے کی کوشش نہ کرو، ورنہ بھٹک جاؤ گے اور منزل تک نہیں پہنچ سکو گے۔

حضرت شیخ جنید بغدادی علیہ الرحمۃ ارشاد فرماتے ہیں: میں نے پہلے علمِ حدیث اور فقہ حاصل کیا، اس کے بعد شیخ حارث محاسبی کی صحبت اٹھائی اور یہی میری کامیابی کا راز ہے۔ علم تصوف کو قرآن کا تابع رہنا چاہیے۔ جس نے تصوف سے پہلے قرآن مجید حفظ نہ کیا ہو (یا نہ پڑھا ہو) اور حدیث میں سند حاصل نہ کی ہو، اسے دوسروں کی رہنمائی کا کوئی حق نہیں۔

(تاریخ تصوف، ص:۲۰۵، علما اکیڈمی، لاہور)

امام ابوالقاسم قشیری، شیخ ابوسعید خراز کا قول نقل کرتے ہوئے اپنی مایۂ ناز تصنیف "رسالہ قشیریہ" میں تحریر فرماتے ہیں:

ہر وہ باطن (تصوف وطریقت) جو ظاہر (فقہ وشریعت) کے خلاف ہو، وہ صوفیۂ کرام کے نزدیک باطل ومردود ہے۔

(رسالہ قشیریہ، ص:۶۲، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد)

زمانۂ رسالت سے اب تک جتنے بھی اکابر صوفیہ ومشائخ گذرے ہیں، وہ سب کے سب ظاہری وباطنی علوم سے آگاہ تھے۔ علم طریقت سے زیادہ علم شریعت اور علم فقہ کے اداشناس تھے۔ دونوں علم ساتھ لے کر چلتے تھے اور منزل مقصود تک رسائی حاصل کرتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

جو صوفی شریعت اور طریقت میں فرق کرے، وہ صوفی نہیں، بلکہ فرقۂ باطنیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ صوفیۂ کرام کتاب وسنت کے عامل تھے اور شریعت وطریقت کے تمام ظاہری وباطنی حدود کا احترام کرتے تھے۔ انھوں نے کبھی ظاہری شریعت (فقہ) اور باطنی شریعت (تصوف) میں تغافل یا تساہل سے کام نہیں لیا۔ (روح تصوف، ص:۵۶-۵۵، امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی)

غرض کہ فقہ وتصوف میں کوئی مغایرت ومخالفت نہیں بلکہ حد درجہ مماثلت ویکسانیت ہے۔ دونوں کتاب وسنت سے ماخوذ ومستنبط ہیں اور دونوں بحر شریعت کی صاف وشفاف نہریں ہیں۔ اور ان دونوں میں اگر کچھ اعتباری فرق بھی ہے تو وہ صرف اس حد تک کہ علمِ ظاہر کا نام فقہ ہے اور علمِ باطن یا فقہ باطن کا نام تصوف ہے۔ دونوں میں فرق ظاہری وباطنی اور نظری وعملی اعتبار سے ہے۔ فقہ وفقیہ، ایک مخصوص علم ونظریہ (احکامِ شرعیہ فرعیہ) سے بحث کرتا ہے، جب کہ تصوف اور صوفی علم کے بجائے عمل اور اخلاص پہ زور دیتا ہے اور عمل کے ذریعے فضل وکمال اور تقویٰ کے حصول کو ہی معراجِ زندگانی اور حاصلِ زیست قرار دیتا ہے۔

حق تعالیٰ کے ساتھ صوفیہ حضرات کا معاملہ حقیقت کا اور بندگانِ خدا کے ساتھ ان کا معاملہ شریعت کا ہوا کرتا ہے، لیکن دونوں جگہ خلوص وبے ریائی شرطِ اول کا درجہ رکھتی ہے۔ فقہ کا مقصود، احکام شرع کا علم واثبات ہے اور تصوف کا مقصد ومنشا روحانیت کا حصول اور طلبِ کمال ہے۔ فقیہ کی نظر حکم ظاہر پہ ہوتی ہے اور صوفی کی نظر حکمِ باطن پہ ہوتی ہے۔

شیخ احمد زرّوق فاسی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الفقهُ مقصود لإثبات الحكم فى العموم فمداره على إثبات ما يسقط به الحرج. والتصوفُ مرصده طلب الكمال و مرجعه لتحقيق الأكمل حكما و حكمةً

.....والفقهؔ والتصوف، أصولهما الكتاب والسنة وقضايا العقل المسلمة بالكتاب والسنّة، لكن الفقيهؔ ينظر من حيث ثبوت الحكم الظاهر، للعمل الظاهر بقاعدته المقتضيه له والصّوفیؔ ينظر من حيث الحقيقة فی عين التحقيق ولانظر فيه للفقيه حتی ظاهره بباطنه... فمن ثم قال ابن الجلاء رحمه الله تعالیٰ: من عامل الحق بالحقيقة والخلق بالحقيقة فهو زنديقؔ ومن عامل الحق بالشريعة والخلق بالشريعة فهو سُنّیؔ، ومن عامل الحق بالحقيقة والخلق بالشريعة فهو صوفیؔ.

(قواعد التصوف، قاعده نمبر: ۳۱، ۳۲، ص:۳۵، بیروت)

شیخ ابو العباس احمد بن احمد زرّوق فاسی (م:۸۹۹ھ) اپنی بلند پایہ تصنیف "قواعد التصوف" کے قاعدہ نمبر (۲۰) میں لکھتے ہیں:

الاشتراك فی الأصل يفضی بالاشتراك فی الحكم، والفقهؔ والتصوفؔ شقيقان فی الدلالة علیٰ أحكام الله وحقوقه، فلها حكم الأصل الواحد فی الكمال والنقص، إذ ليس أحدهما بأولیٰ من الأخر فی مدلوله، وقد صح أن العمل شرط كمال العلم فيهما وفی غيرهما لا شرط صحة فيه. (قواعد التصوف، ۲۹، دار الكتب العلميه، بيروت)

یعنی اشتراک فی الاصل، اشتراک فی الحکم کا تقاضا کرتا ہے۔ فقہؔ اور تصوف اس اعتبار سے ایک دوسرے کے شریک اور مماثل ہیں کہ دونوں احکام الٰہیہ اور حقوقِ الٰہیہ پر دلالت کرتے ہیں۔ تو یہ دونوں کمال و نقصان میں اصلِ واحد اور حکمِ واحد کے درجے میں ہیں۔ اپنے مدلولات و مقتضیات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے، کیوں کہ دونوں کے مدلولات ایک ہیں۔ اور یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ فقہ و تصوف میں عمل شرط ہے۔

شیخ احمد زرّوق فاسی کی اس عبارت کے تحت حاشیہ میں فضیلۃ الشیخ محقق عبد المجید خیالی لکھتے ہیں:

الصواب كما سبق، لاتصوف إلّا بفقه ولا فقه إلّا بتصوف ولا هما الّا بايمان.

یعی حق و صواب وہی ہے جو گذرا۔ فقہ کے بغیر تصوف اور تصوف کے بغیر فقہ نہیں پایا جاتا۔ (قواعد التصوف، ص:۲۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

شیخ احمد زرّوق فاسی اسی کتاب میں دوسری جگہ "فقہ و تصوف کے باہمی امتزاج" پر قدرے لطیف فرق کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

حكم الفقه عام فی العموم، لإن مقصده إقامة رسم الدين ورفع مناره و إظهار كلمته، و حكم التصوف خاص فی الخصوص، لأنه معاملة بين العبدوربّه، من غير زائد علیٰ ذالك، فمن ثم صح إنكار الفقيه علی الصوفی ولم يصح إنكار الصوفی علیٰ الفقيه ولزم الرجوع من التصوف للفقه فی الأحكام والحقائق لا بالنبذ والترك وصح الاكتفاء به دونه ولم يكف التصوف عن الفقه بل لا يصح دونه ولا يجوز الرجوع منه إليه إلا به. (قواعد التصوف، ص:۳۲، بیروت)

غرض کہ جس جہت سے بھی دیکھیے فقہؔ اور تصوفؔ میں بڑا گہرا رشتہ اور شدید ارتباط و امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ائمہ و فقہا تصوف کے مایۂ ناز عالم و فاضل گذرے ہیں اور جلیل القدر مشائخ و صوفیہ، فقہ و شریعت کے دانائے راز اور ائمہ فقہ کے مقلد ہوئے ہیں۔ اور فقہا و محدثین یا فقہا و صوفیہ کے درمیان جو اختلاف رونما ہوا ہے، یہ محض علمی اور فروعی اختلاف ہے۔ جو عالم و فقیہ تصوف کے رمز آشنا تھے، انھوں نے کبھی بھی تصوف یا صوفیہ کے خلاف عَلَم بغاوت بلند نہیں کیا۔ اگر کیا بھی تو نام نہاد جاہل صوفیہ کے خلاف، نہ کہ تصوف اور مشائخِ طریقت کے خلاف؟

صوفیۂ کرام کا فقہی مذہب و مسلک:

بہر کیف! زمانۂ خیر القرون کے بعد جتنے بھی اکابر صوفیہ اور ائمہ تصوف گذرے ہیں، وہ سب کے سب کسی نہ کسی امام کے مقلد تھے اور ان کا ایمان و رجحان یہ تھا کہ فقہ، تصوف کے لیے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخِ تصوف "ائمہ اربعہ" میں سے کسی ایک مسلک کی تقلید و پیروی کو اپنے اوپر ضروری سمجھتے تھے۔ اگر فقہ و تصوف میں ربط و امتزاج نہ ہوتا تو صوفیۂ کرام، فقہ اور فقہائے کرام کے مذہب و مسلک پہ ہرگز گامزن نہ ہوتے۔

حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

صوفیۂ کرام کا مذہب اصول و فروع میں فقہاء کے تابع ہے۔ کیوں کہ فقہائے کرام نے تلاش و جستجو کے بعد فقہی اور شرعی احکام و مسائل مختلف فصلوں میں جمع کر دیا ہے۔ حضرت جنید بغدادی، امام ابو ثور کے مذہب پر تھے۔ شیخ شبلی، مالکی تھے۔ شیخ محاسبی، شافعی تھے۔ شیخ جُریری، حنفی تھے اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانی، حنبلی تھے۔ جیسا کہ ائمۂ صوفیہ نے بیان کیا ہے۔ تاہم وہ مذاہب مذکورہ سے وہ حکم اختیار کرتے جو حدیث کے زیادہ مناسب ہوتا۔ فضائل میں صوفیۂ کرام کا مذہب محدثین کا تابع ہے۔ وہ اسی فضیلت کو کمی بیشی کے ساتھ قبول کرتے ہیں جو واضح ہو اور درجۂ صحت کو پہنچ گئی ہو یا صحت کے قریب ہو، بشرطیکہ فقہائے کرام نے اس کا انکار نہ کیا ہو۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے: الصّوفی لا مذهب له۔ کہ صوفی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فضائل میں کسی مذہب کا پابند نہیں ہوتا۔ (یہ مطلب

ہرگز نہیں کہ وہ فقہ میں کسی مذہب کا مقلّد نہیں ہوتا)۔

(تعارفِ فقہ وتصوف، ص:۱۳۹-۱۳۸، مکتبہ قادریہ، لاہور)

تصوف، علمی نظریہ نہیں، بلکہ عملی تجربہ کا نام ہے۔ یہاں بیک وقت شریعت کے ظاہری اور باطنی احکام پر عمل کیا جاتا ہے۔ حسن اخلاق کی شیرازہ بندی اور روحانی اقدار کی تکمیل اسی تصوف کے ذریعے ہوا کرتی ہے۔ گویا تصوف، اخلاقیات و روحانیات کا داعی اور خانقاہ، انسانیت و روحانیت کی تربیت گاہ ہے، جہاں ملکوتی صفاتی رکھنے والے روحانی افراد پروان چڑھتے ہیں۔ اس روحانی مدرسے میں علم و عمل، اخلاص، زہد و تقویٰ، حسنِ اخلاق، تزکیۂ نفس اور تطہیرِ باطن کے اسباق پڑھائے جاتے ہیں، جس کے معلم، صوفیہ اور متعلم ”تصوف کے طالب علم“ کہے جاتے ہیں۔ ”فقہ ظاہر“ مدارس میں پڑھایا جاتا ہے، جب کہ ”فقہ باطن“ یعنی تصوف کا درس خانقاہوں میں دیا جاتا ہے۔

خوشا مسجد و مدرسہ، خانقاہے
کہ در وے بود قیل و قالِ محمد ﷺ

احساس وانفاس کی گہرائیوں میں اتر کر اذہان و قلوب کو روحانیت کی آماج گاہ بنانے والا یہ ”فقہِ باطن“ (تصوف) بہر گام اپنا سفر ”فقہِ ظاہر“ کی روشنی میں طے کرتا ہے۔ تصوف، فقہ کے انوار سے ہر لمحہ خود بھی جگمگاتا ہے اور دوسروں کو بھی مصفّٰی و مجلّٰی کر دیتا ہے۔ اس مکتبِ عشق اور مدرسۂ فقہِ باطن میں داخلہ لے کر تو دیکھیے، آپ ہمارے دعویٰ کی صداقت کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی کے بقول:

علم تصوف کا معلوم، تمام معلومات سے افضل ہے۔ کیوں کہ اس کی ابتدا، اللہ تعالیٰ کے خوف کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اس کا درمیانی حصّہ، اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ کرنے کی طرف اور اس کا آخری حصہ، اللہ تعالیٰ کی معرفت اور سب کچھ چھوڑ کر اس کے ساتھ تعلق قائم کر لینے کی ہدایت کرتا ہے۔ تصوف کمال و ترقی کا سبب ہے۔ اسی کے ذریعے اخلاق کی اصلاح، باطن کی صفائی، دل کا اللہ تعالیٰ سے خصوصی تعلق اور ایسے علم کا انکشاف حاصل ہوتا ہے جو انسان نے پڑھا نہیں اور یہ عمل کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

(تعارف فقہ و تصوف، ص:۱۳۵-۱۳۴، پاکستان)

علم تصوف کی فضیلت و اہمیت بیان کرنے کے بعد شاہ عبد الحق محدث دہلوی نے ”فقہ و تصوف کے باہمی ربط و تعلق“ کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ: عمل کے میدان میں تصوف، فقہ کے بغیر صحیح و درست نہیں۔ اسی لیے فقیہ صوفی کا حال کامل ہے، برخلاف اس صوفی کے جو فقہ کا عالم نہیں۔ (اس کا حال ناقص ہے)۔ (تعارفِ فقہ و تصوف، ص:۱۳۳، پاکستان)

شیخ محقق دہلوی مزید لکھتے ہیں:

فقہ کا حکم صفتِ عموم کے ساتھ متّصف ہے، کیوں کہ فقہ کا مقصد دین و شریعت کے احکام کو قائم کرنا اور اس کی نشانیوں کو ظاہر و بلند کرنا ہے۔ اور تصوف کا حکم صفتِ خصوص کے ساتھ موصوف ہے، کیوں کہ تصوف بندے اور اللہ ربّ العزّت کے درمیان معاملہ ہے، اس سے زائد نہیں۔ احکام اور حقائق کے سلسلے میں تصوف سے فقہ کی طرف رجوع ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ فقہ کو پسِ پشت ڈال دیا جائے اور اس کے بغیر (یعنی فقہ کے بغیر تصوّف پہ) اکتفاء کیا جائے۔ تصوف، فقہ کے بغیر نہ صرف یہ کہ کافی نہیں بلکہ صحیح ہی نہیں ہے۔ تصوف کی طرف رجوع فقہ کے ساتھ جائز ہے۔ اگرچہ تصوف، فقہ سے مرتبہ میں اعلیٰ ہے، تاہم فقہ میں سلامتی زیادہ اور مصلحت کا پھیلاؤ زیادہ ہے۔ فقہ اور تصوف میں سے کوئی بھی دوسرے کے بغیر مکمّل نہیں ہوتا۔ جیسے طب کا علم تجربہ کی جگہ اور تجربہ علم کی جگہ کافی نہیں۔

(تعارف فقہ و تصوف، ص:۱۲۳، پاکستان)

مندرجہ بالا اقتباس کی آخری سطر اور آخری جملہ ببانگِ دہل اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ تصوف اور فقہ کے درمیان اس قدر مضبوط رشتہ اور ان کے مابین اتنا گہرا امتزاج و ارتباط ہے کہ فقہ کے بغیر تصوف نا مکمل ہے اور تصوف کے بغیر فقہ ناقص و ادھورا ہے۔

حضرت امام مالک علیہ الرحمہ نے بجا فرمایا ہے:

من تفقّه ولم يتصوّف فقد تفسّق ومن تصوّف ولم يتفقّه فقد تزندق.

(شرح عين العلم، لملاعلی قاری، ۱/ ۳۳، دار الفكر، بيروت)

امام الصوفیہ حضرت شیخ أحمد زرّوق فرماتے ہیں:

لا تصوف إلا بفقه إذ لا تعرف أحكام الله الظاهرة إلامنه ولا فقه إلا بتصوف، إذلا عمل إلا بصدق وتوجه ولاهما (الفقه والتصوف) إلا بايمان، إذ لا يصح واحدمنهما بدونه، فلزم الجميع لتلازمها فی الحكم، كتلازم الأرواح للأجساد ولا وجودلها إلا فيها، كما لا كمال له إلّا بها، فافهم. (قواعد التصوف، قاعده نمبر:٤، ص:٢٢، بيروت)

ترجمہ: فقہ کے بغیر تصوف نہیں پایا جاتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے ظاہری احکام فقہ کے ذریعے ہی معلوم ہوتے ہیں اور تصوف کے بغیر فقہ کا وجود نہیں، کیوں کہ کوئی عمل صدقِ نیت اور توجّہ الٰہیہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ اور فقہ و تصوف دونوں کا تعلق ایمان و شریعت سے ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی ایمان و شریعت کے بغیر درست نہیں۔ تو جس طرح جسم اور روح میں تلازم ہے یعنی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں، ٹھیک اسی طرح فقہ و تصوف میں بھی تلازم ہے اور ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جسم کے بغیر روح کا وجود نہیں اور روح کے بغیر جسم کی حیات نہیں۔ اسی طرح فقہ

کے بغیر تصوف کا اور تصوف کے بغیر فقہ کا وجود نہیں۔

سراج الامت حضرت امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ والرضوان نے اسی عموم کا لحاظ کرتے ہوئے عقائد و کلام سے متعلق اپنی کتاب کا نام "فقہ اکبر" رکھا ہے۔ علوم و فنون کی جمع و تدوین سے قبل تصوف بھی دینی علوم کا ایک اہم شعبہ اور فقہ و شریعت کا ایک اٹوٹ حصہ تھا۔

فقہ کے حوالے سے بعض اہل علم نے بڑی نفیس توضیح فرمائی ہے اور وہ یہ کہ شریعت کے احکام و مسائل کی تین صورتیں ہیں:

(۱) فقہ اسلامی (فقہ نعمانی) (۲) فقہ کلامی (علم عقائد و کلام)

(۳) فقہ احسانی (علم تصوف و طریقت)

تیسری صدی ہجری سے "علم تصوف" اپنے موضوع و منہج اور غرض و غایت کے لحاظ سے باضابطہ ایک مستقل فن کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ علوم اسلامیہ کی تدوین سے قبل علم تصوف محض عبادت و ریاضت کے طریقے پر مشہور تھا۔ جب علوم و فنون مدوّن و مرتب ہونے لگے اور ائمہ و فقہاء اور محدثین و مفسرین اپنے متعلقہ فنون میں کتابیں مدوّن کرنے لگے تو صوفیہ کرام بھی حرکت میں آئے اور زہد و ورع، محاسبۂ نفس اور آداب طریقت وغیرہ کے مسائل و مباحث کتابوں میں جمع کرنے لگے اور اس طرح دیگر شرعی علوم و فنون کے ساتھ "علم تصوف" بھی باضابطہ فن کی حیثیت سے مشہور و متعارف ہوگیا۔

علامہ ابن خلدون تحریر فرماتے ہیں:

فلما كتبت العلوم و دونت، والف الفقهاء فى الفقه و أصوله والكلام والتفسير وغير ذالك، كتب رجال من أهل هذه الطريقة (الصوفية) فى طريقتهم، فمنهم من كتب فى الورع ومحاسبة النفس، كما فعله المحاسبى فى كتاب "الرعاية" ومنهم من كتب فى آداب الطريقة وأذواق أهلها و مواجدهم، كما فعل القشيرى فى "الرسالة" وصار علم التصوف فى الملة علما مدونا بعد ان كانت الطريقة (التصوف) عبادة فقط. (مقدمہ ابن خلدون، ۳۵، بیروت)

مندرجہ بالا تشریحات سے ظاہر ہے کہ فقہ و تصوف میں بڑا گہرا رشتہ ہے اور موجودہ تصوف، علومِ شریعتِ اسلامیہ کا ایک حصّہ اور فقہ کا ایک اہم جزو ہے۔

موضوع کی مناسبت سے اور اپنے موقف کی تائید و توثیق میں دو اہم اقتباس نقل کرکے راقم الحروف اپنا مقالہ ختم کرتا ہے۔

(۱) امام غزالی علیہ الرحمۃ نے فقہ میں تصوف کو سمو دیا ہے اور اس طرح دونوں (فقہ و تصوف) کو ایک ساتھ ملحوظ رکھنے سے فقہ و تصوف کی قدر و قیمت میں حد درجہ اضافہ ہوگیا ہے۔ امام غزالی علیہ الرحمۃ اس نکتۂ جاں فزا سے خوب آگاہ ہیں کہ فقہ و قانون میں اگر متصوفانہ عنصر (تصوف کی جھلکیاں) معدوم ہو جائے تو پھر اس میں (فقہ میں) وہ زندگی، وہ روحانیت اور وہ معنویت باقی نہیں رہتی جو مقصودِ اسلام ہے۔ بلکہ پھر قانون و فقہ میں ایک انداز کا جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک طرح کی تنگ نظرانہ ذہنیت اُبھر آتی ہے اور (فقہ کا) یہ سارا کارخانہ ہی بے جان اور ٹھس ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسی طرح اگر تصوف کو قیدِ شریعت (فقہ) میں محصور نہ رکھا جائے اور اس کی فقہی و دینی حدود کی تعیین نہ کی جائے تو یہ تصوف بے راہ روی، الحاد اور زندقہ کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ تصوف سالک میں ایمان و اخلاص کے جذبوں کو ابھارے، الٹا ضلالت و گمراہی کا باعث ہوتا ہے۔

گویا فقہ و تصوف میں تعلق و رشتہ کی وہی نوعیت ہے جو جسم و روح میں ہے۔ اگر فقہ کے احکام و مسائل میں تصوف کی روح جاری و ساری ہے تو جسم کا ڈھانچہ بھی قائم ہے اور یہ روح نہیں تو پھر یہ ڈھانچہ نہیں لاش ہے۔ (تعلیماتِ امام غزالی، ص:۸۵، اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی)

علمِ تصوف کے عظیم اسکالر سید عبدالرحمان بخاری لکھتے ہیں:

فقہ اور تصوف کا باہمی تعلق بڑا گہرا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی پیکر (شریعت) کے دو اجزاء اور ایک ہی حقیقت (دین و اسلام) کے دو پہلو ہیں۔ ایک فقہ ظاہر ہے اور دوسرا فقہ باطن۔ دونوں وحدت کے اٹوٹ رشتے میں پروئے ہوئے باہم لازم و ملزوم ہیں۔ ایک زندگی گذارنے کا طریقہ سکھاتا ہے اور دوسرا زندگی کو معتبر بناتا ہے۔ ایک تہذیب کا خاکہ بناتا ہے اور دوسرا اس میں رنگ بھرتا ہے۔ ایک حقیقت کا راستہ دکھاتا ہے اور دوسرا منزل تک پہنچاتا ہے۔

(۱)-فقہ، شریعت کا ظاہر ہے اور تصوف اس کا باطن-(۲)-فقہ، معاشرت کا عملی دائرہ ہے اور تصوف اس کا اخلاقی پہلو-(۳)- فقہ، احکام کا علم ہے اور تصوف ان پر عمل کی تحریک-(۴)- فقہ، آداب کا مجموعہ ہے اور تصوف ان کا حسن-(۵)- فقہ، معاملات کا ضابطہ ہے اور تصوف ان کی تکمیل-(۶)- فقہ ایک مطالعہ ہے اور تصوف ایک رویّہ۔ مطالعہ شعور دیتا ہے اور تصوف برتاؤ سکھاتا ہے-(۷)- فقہ سے اچھی عادات پروان چڑھتی ہیں اور تصوف انھیں استقامت میں ڈھالتا ہے-(۸)- فقہ سے عمل کا سانچہ ملتا ہے اور تصوف اس میں اخلاص پیدا کرتا ہے-(۹)- فقہ سے کردار نشوونما پاتا ہے اور تصوف اسے جذبوں سے ہمکنار کرتا ہے۔

غرض فقہ سے شریعت ہمارے جسموں پر لاگو ہوتی ہے اور تصوف اسے دلوں میں اتارتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ اور تصوف ہمیشہ اسلامی معاشرے میں ساتھ ساتھ رہے ہیں اور ان میں منافرت پیدا کرنے کی ہر کوشش مذموم اور رائیگاں ٹھہری۔ (تعارف فقہ و تصوف، ص:۲۶-۲۷، مکتب قادریہ، لاہور)

اسلام کی ترویج واشاعت میں
مدارسِ اسلامیہ کا اہم کردار

محسن رضا ضیائی

ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دینِ قویم کی تبلیغ واشاعت اوراس کی تعلیمات وہدایات کی تشہیر وترسیل کے لیے ہر قوم میں اپنے انبیاورسل علیہم السلام کو بھیجا جو دین کے داعی ومبلغ بن کر اسلام کی ترویج واشاعت کا اہم فریضہ بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ان کے مؤثراوردل نشیں اندازِ تبلیغ سے ہزاروں معبودانِ باطل کے پرستاروں نے کفروشرک سے توبہ کرکے دینِ حنیف کو اپنایا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے دینِ متین کی دعوت وتبلیغ اور قوم کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اپنے پیارے حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ کو اس خاک دانِ گیتی پر مبعوث فرمایا۔آپ نے بھی اپنے مؤثراندازِ تبلیغ، عمدہ گفتار و کردار، دل نشیں آواز اور پُر مغز وحکمت بھری باتوں سے اسلام کی اشاعت وتبلیغ فرمائی۔آپ ہی کی دعوت وتبلیغ اور محنت وکوشش کا نتیجہ تھا کا اسلام پورے آب وتاب کے ساتھ مشرق سے نکل کر مغرب، شمال اور جنوب کے تمام اطراف واکناف میں پھیل گیا۔

مدارس کا آغاز وارتقا: آپ نے اپنے اور دیگر سابقین انبیاے کرام کے اس سلسلۃ الذہب کی نمائندہ کڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی ایک متحرک وفعال جماعت تیار فرمائی اور انہیں تعلیم وتربیت دینے اور دعوت وتبلیغ کے طرق واسالیب سے آشنا کرنے کے لیے ایک اسلامی مدرسے کی بنیاد ڈالی جو تاریخ اسلام میں "الصفہ" کے نام سے مشہور ہے۔"الصفہ" دورِ نبوی ﷺ کا یہ سب سے پہلا مدرسہ تھا جس کی بنیاد اللہ کے پیارے رسول ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں رکھی جو مسجد نبوی سے متّصل پیچھے کی جانب تھوڑا سا چبوترا بنادیا گیا تھا جہاں مہمان اترتے تھے اور علم سیکھنے والے فقرا صحابہ وہاں مستقل طور پر رہتے تھے۔انہی صحابہ کو اصحابِ صفہ کہا جاتا ہے جن کا ذکر قرآن عظیم واحادیث رسول میں بھی موجود ہے۔چنانچہ قرآنِ کریم میں اصحابِ صفہ کی شان میں یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی ہے:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهٗ (سورہ کھف، آیت ۲۸)

ترجمہ: اپنی جان ان سے مانوس رکھو جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی رضا چاہتے ہیں۔

اسی طرح حدیثِ رسول ﷺ میں بھی مذکور ہے کہ :ان کی تعداد میں موت یا سفر یا تزوج کے سبب سے کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ بعض وقت ان کی تعداد ستر تک پہنچ جاتی تھی۔باہر سے مدینہ میں اگر کوئی آتا اور شہر میں اس کا کوئی شریف جان پہچان نہ ہوتا تو وہ بھی صفہ میں اترا کرتا تھا۔

حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں سو سے زائد اصحابِ صفہ کے اسما شمار کرائے ہیں۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، ص ۴۸۶)

اسی طرح علامہ جلال لدین سیوطی علیہ الرحمۃ نے بھی اصحابِ صفہ کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے جس میں آپ نے ۱۰۰ ر آدمیوں کے اسما بالترتیب ذکر کیے ہیں۔

صفہ کے تمام صحابۂ کرام اللہ کے پیارے رسول ﷺ سے اکتساب فیض کیا کرتے تھے۔صبح وشام ان کے کانوں میں قرآن وحدیث کے لاہوتی نغمے گونجتے تھے جسے وہ یاد کرلیتے تھے اور پھر جب کبھی اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لیے کہیں بھیجنا ہوتا تو اللہ کے پیارے رسول ﷺ ان ہی تربیت وتعلیم یافتہ اصحابِ صفہ کی جماعت کو روانہ فرماتے تھے ۔روایتوں میں ملتا ہے کہ غزوۂ مَعونہ میں انہیں میں سے ستر اصحاب کو اسلام کی تعلیم دینے کے لیے بھیجا گیا تھا' جنہیں راستے میں لے جاکر شہید کردیا گیا تھا۔ان میں سے اکثر دینی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ تجارت وحرفت اور محنت ومزدوری کیا کرتے تھے۔

مختصر یہ کہ " الصفہ" یہ پہلا اسلامی مدرسہ تھا جہاں پر سیکڑوں صحابۂ کرام دینی علوم کی تحصیل وتکمیل میں لگے رہتے تھے اور جب کبھی موقع ملتا تو دور دراز مقامات پر جاکر اسلام کی شمع روشن کرتے تھے۔ان ہی درس گاہِ نبوی کے طالب علموں سے اسلام کو بہت زیادہ فروغ ملا۔

عالم اسلام کے چند بڑے اور قدیم مدارس:

تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اواخر اور

مترجم وکالم نگار' روزنامہ "ورقِ تازہ" نانڈیر۔

تیسری صدی ہجری کے اوائل میں بغداد، مصر، غزنی، اندلس، مراغہ، خراسان، سمرقند اور دیگر مشرقی و مغربی ممالک میں کئی ایک مدارس کا قیام عمل میں آیا اور یہاں سے فارغ ہونے والے علما، فضلا، مفکرین اور دانشوران اپنے علم و فضل اور کمالِ زہد و تقوے کی بنیاد پر سارے عالم پر چھاگئے اور تحریر و تقریر، تذکیر و موعظت اور اپنے حسنِ اخلاق و کردار سے دینِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں بنیادی رول ادا کیا۔ ہم یہاں مشرقِ وسطیٰ کے چند مشہور و معروف مدارس اسلامیہ کا اجمالی خاکہ پیش کر رہے ہیں۔

مدرسہ نظامیہ: زمانۂ نبوی کے بعد سب سے زیادہ جس مدرسے کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ مدرسہ "نظامیہ" ہے جس کی تاریخ بہت پرانی ہے، اپنے دور کا یہ منفرد ادارہ تھا جو پورے بغداد میں علوم و فنون کا مرکز و گہوارہ مانا جاتا تھا۔

تاریخوں میں ملتا ہے کہ اسے ملک شاہ سلجوقی الپ ارسلان کے وزیر نظام الملک خواجہ ابوعلی الحسن طوسی م ۴۸۵ھ نے سال ۴۵۹ھ میں قائم کیا تھا۔ اس کی شہرت پوری اسلامی دنیا میں گونج رہی تھی۔ اس مدرسے کو انفرادیت و اہمیت اس لیے بھی حاصل تھی کہ اس میں امام جوینی، ابواسحاق شیرازی، امام غزالی اور امام ابوبکر الشاشی جیسی یکتائے روزگار اور عہد ساز شخصیات تدریس کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھیں۔

مدرسہ نظامیہ سے فارغ ہونے والے طلبہ میں وقت کے جید عالم، بلند پایہ فقیہ، بے مثال مناظر، دور اندیش مفکر، محدث جلیل اور کمالِ زہد و تقویٰ پر فائز ایسے ایسے عارف باللہ، ولیِ کامل اور صوفیِ باصفا تھے جنھوں نے اسلام کی ایک ایسے نازک، پرآشوب اور پرفتن دور میں مدد و نصرت اور تجدید و احیا فرمائی جس وقت چاروں طرف سے اس پر مخالفین کی یلغار ہو رہی تھی۔ فکری، نظریاتی اور اعتقادی حملوں نے مسلمانوں کو انتشار و افتراق کے گڑھے میں ڈھکیل رکھا تھا۔ فلاسفہ کے نئے نئے نظریات و مزعومات اور اہلِ بدعات کے اختراعات و خرافات نے سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے دین سے بے راہ رو اور بے گانہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔

مدرسہ نظامیہ کے علاوہ بغداد اور اس کے اطراف و اکناف میں اور بھی بہت سے مدارس قائم تھے جو دینی علوم و فنون کے مراکز سمجھے جاتے تھے۔ جن میں حوزۃ النجف، روضۂ امام حسین، الحضرۃ القادریہ مسجد کاظمیہ، کلیۃ الامام الاعظم، خزانۃ القرویین، جامعہ محمد بن علی السمنوسی، زاویۃ عبدالسلام الاسمر، مدرسۃ عثمان باشا وغیرہ شامل ہیں۔

جامعہ قرطبہ: یورپ کے ملک اندلس (اسپین) میں جو مسلمانوں کے زیر نگین تھا قرطبہ اور غرناطہ علم و فن اور ارباب کمال کے بڑے مرکز بن گئے تھے۔ قرطبہ کی مشہور عالم "جامع مسجد قرطبہ" میں خلیفہ الحکم ثانی نے جامعہ قرطبہ کے نام سے ایک بڑی یونیورسٹی قائم کی تھی۔ جہاں پر مفت تعلیم کا انتظام تھا، یہاں پر مشرق و مغرب کے جلیل القدر اساتذہ تدریس کی خدمت پر مامور تھے اس یونیورسٹی کی عظمت کا اندازہ اس کے کتب خانہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے، جس میں چار لاکھ نادر کتابیں موجود تھیں اور اس کی صرف فہرست چوالیس جلدوں پر مشتمل تھی۔ (تاریخ اسلام پر ایک نظر، ص:۵۶۲)

مدرسہ باب الازج / مدرسہ قادریہ: چھٹی صدی ہجری کا ایک ممتاز اور عظیم الشان ادارہ تھا جو مدرسہ نظامیہ کے بعد علوم و فنون کا منبع و مرجع سمجھا جاتا تھا۔ ابتدا میں اس مدرسے کا نام "باب الازج" تھا لیکن ۵۲۸ھ میں اس کی جدید طور پر تعمیر و توسیع ہوئی، جس کے بعد اس کا نام حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کی نسبت سے "باب الازج" سے بدل کر "مدرسہ قادریہ" رکھ دیا گیا۔ اس ادارے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسندِ تدریس پر متمکن تھے۔

(غنیۃ الطالبین ----- سوانح شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

مدرسہ سلطان محمود غزنوی: سلطان محمود غزنوی ہندوستان میں فتوحات کے دوران متھرا شہر کی خوبصورت جامع مسجد سے متاثر ہوئے تو حکم دیا کہ غزنی میں ایک عالی شان مسجد بنوائی جائے۔ چنانچہ ایک کثیر رقم خرچ کرکے ایک نادرۂ روزگار مسجد تیار کی گئی جسے عروس الفلک (آسمانی دلہن) کا نام دیا گیا۔ اسی مسجد میں علوم نقلیہ و عقلیہ کی تدریس کے لیے ایک بہترین دارالعلوم تعمیر کرایا۔ یہاں پر کامل ترین علما و فضلا ایشیا بھر کے طلبہ کو درس دیا کرتے تھے۔ یہ کالج ایشیا بھر میں اپنی نظیر آپ تھا۔ (اخبار الاندلس کا اردو ترجمہ، ص:۶۵۶ وبعد)

مدرسہ امام ابو حنیفہ: اس مدرسے کی بنیاد دارالخلافہ بغداد میں علمائے کرام نے بغدادی مسلمانوں کے قیمتی تعاون سے ۱۰۶۶ء میں رکھی، جو مدرسہ نظامیہ سے پہلے قائم کیا گیا تھا، تاہم مدرسہ نظامیہ ہی کو تاریخِ اسلام میں اولیت حاصل ہے۔ اس ادارے نے علما و فضلا تیار کرکے بغداد اور اس کے اطراف و جوانب میں اسلام کو بے انتہا فروغ و استحکام بخشا۔

جامع القرویین (مراکش): مراکش جس کو انگریزی میں Morroco کو اور عربی میں المغرب کہتے ہیں، اس کا ایک شہر فاس تاریخ میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ فاطمہ الفہری جو ایک دولت مند تاجر کی بیٹی تھی

،اس نے اسی شہر میں ۸۵۹ء میں جامع القرویین کی اساس وبنیاد رکھی جس کو اکثر مؤرخین دنیا کی پہلی یونیورسٹی شمار کرتے ہیں۔ یہ تیسری صدی ہجری کی ایک عظیم اسلامی یونیورسٹی ہے۔

جامع ازہر (مصر): جامع القرویین کے قیام کے بعد اس کی دینی وتعلیمی سرگرمیوں اور دین کی تبلیغ واشاعت کے حوالے سے اس کی بے شمار خدمات سے متاثر ہوکر اسی طرز پر ۹۷۰ء میں مصر کے شہر قاہرہ میں جامع ازہر کا قیام عمل میں آیا جسے دنیا کی دوسری سب سے بڑی قدیم یونیورسٹی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ دینی وعصری علوم کی منظم اسلامی درسگاہ ہے، جہاں دنیا کے ہر کونے سے طالبانِ علوم نبویہ اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کے لیے کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ یہ ادارہ آج تک جامعہ ازہر کے نام سے قائم ہے اور اسے عالم اسلام کی سب سے بڑی اور قدیم یونیورسٹی کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس ادارے سے اب تک لاکھوں کی تعداد میں طلبا دینی وعصری علوم سے آراستہ ہوچکے اور ہنوز ہورہے ہیں۔ اس کے آغاز سے لے کر اب تک یہاں کے ابناوفارغین نے بین الاقوامی سطح پر اسلام کی تبلیغ وتشہیر کا فریضہ بطریقِ احسن انجام دیا ہے اور آج بھی پوری دنیا میں اسلام اور اس کی تعلیمات کو فروغ دینے میں مستعد وسرگرم عمل ہیں۔

اس کے علاوہ بھی تاریخ میں کئی ایک مدارس کا بھی ذکر ملتا ہے جو اپنے وقت کے مروجہ علوم وفنون میں یکتائے روزگار تھے اور وہاں سے اسلام کی تبلیغ واشاعت کا بہت زیادہ کام ہوا۔ چنانچہ 'روائع من حضارتنا" کے مؤلف دکتور مصطفی السباعی رقم طراز ہیں :

سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر، دمشق، موصل اور بیت المقدس ان تمام شہروں میں مدارس وجامعات کی اساس وبنیاد رکھی جو ان کے زیرِ حکومت تھے۔ اسی طرح نورالدین شہید نے بھی دمشق، حلب، حماہ، حمص اور بعلبک میں کل چودھا مدارس قائم کیے تھے۔

(دکتور مصطفی السباعی: روائع من حضارتنا" ،ص:۲۱۳)

مذکورہ بالا مدارس کے فارغین جن کی ذات ستودہ صفات سے اسلام کو بہت زیادہ فروغ ملا ان حضرات نے ایسے وقت جو کہ آفات وبلیات اور شرور وفتن کا دور تھا، ایسے نازک حالات میں دینِ اسلام کی تعمیر وترقی میں بے لوث قربانیاں دی اور اپنے علمی کارناموں اور دینی خدمات سے چمنِ اسلام کو خوب ہرا بھرا کیا۔

ہندوستان کے چند قدیم اور بڑے مدارس:

اسی طرح برصغیر ہند کے چند بڑے مدارس جن ہم کا یہاں اجمالی طور پر ذکر کررہے ہیں جنہوں اپنے قیام سے لے کر اب تک دینِ اسلام کے فروغ واستحکام اور شریعت وسنت نبوی ﷺ کے تحفظ وبقا کے لیے ان گنت وبے شمار قربانیاں دی ہیں۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ مدارسِ اسلامیہ ہی کی مساعیٔ جمیلہ اور تبلیغ وہدایت کا نتیجہ ہے کہ یہاں لوگ اسلام اور اس کی تعلیمات وہدایات سے روشناس ہوئے اور اس کے دامن سے وابستہ ہوئے۔

ان مدارس میں خاص طور پر" ،منظر اسلام، الجامعۃ الاشرفیہ بریلی شریف، مظہر اسلام، جامعہ نعیمیہ مرادآباد، جامعہ علیمیہ جمداشاہی، جامعہ امجدیہ گھوسی، الجامعۃ الاسلامیہ روناہی، جامعہ مرکز الثقافۃ السنیہ کیرلا، جامعہ سعدیہ کیرلا، اور ان کے علاوہ بھی بہت سے دیگر مدارس وجامعات ہیں جن کی فہرست بڑی طویل ہے، جہاں سے دینِ اسلام کی بے لوث خدمت ہورہی ہیں تاہم مضمون کی طوالت کے خوف سے یہاں چند کا اختصار کے ساتھ تعارف پیش کررہے ہیں۔

منظرِ اسلام (بریلی شریف) : جامعہ منظر اسلام ہندوستان کا قدیم اور عظیم الشان ادارہ ہے۔ یہ امام احمد رضا خان فاضلِ بریلوی علیہ الرحمہ کا قائم کردہ ادارہ ہے اسی لیے اس کو پوری دنیا میں بے پناہ شہرت ومقبولیت بھی حاصل ہے۔ امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ نے ۱۹۰۴ء میں اس کی بنیاد رکھ کر ہندوستانی مسلمانوں کے ایمان وعقائد کا تحفظ فرمایا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد اہل سنت وجماعت کے عقائد ونظریات اور اکابر واسلاف کے اقدار وروایات کی حفاظت واشاعت کرنا ہے، جس کے لیے وہ اپنے قیام سے ہی مسلکِ اہلِ سنت وجماعت اور عوام کے ایمان وعقائد کا محافظ وپاسبان رہا ہے۔ اس ادارے نے آپ کی دینی، علمی اور قلمی خدمات کی اشاعت وتبلیغ اور مذہبِ اہلِ سنت وجماعت کے فروغ وارتقا میں بنیادی اور کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اب تک مختلف میدانوں اور شعبوں میں قابلِ فخر افراد تیار کرکے دین وسنیت کی ترویج واشاعت میں غیر معمولی خدمات انجام دیا ہے۔ کئی شعبہ جات پر مشتمل یہ ادارہ روز افزوں شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ یہاں سے اب تک سینکڑوں ایسے علما وفضلا فارغ التحصیل ہوچکے ہیں جو دنیا کے بیشتر ممالک میں دینی خدمات کی انجام دہی میں لگے ہوئے ہیں۔

الجامعۃ الاشرفیہ (مبارکپور): یہ وسعت ورقبے اور علوم وفنون کے لحاظ سے ہندوستان کا سب سے بڑا تاریخ ساز ادارہ ہے یہ صوبۂ اترپردیش کے ضلع اعظم گڈھ کے اندر قصبہ مبارک پور میں واقع ہے جو ریشمی صنعت کے لیے بھی ملک بھر میں کافی شہرت رکھتا ہے۔

جماعت اہلِ سنت کے قدیم و متوارث عقائد و نظریات کے تحفظ وبقا اور دینِ اسلام کے فروغ و ترقی کی خاطر اس ادارے کا قیام عمل میں آیا۔ حضور مفتیِ اعظم ہند، حضور سید العلما مارہروی، شیخ المشائخ حضور اشرفی میاں، حافظ ملت علیہ الرحمۃ اور دیگر اکابر و اعاظم اہلِ سنت و جماعت رحمہم اللہ علیہ اجمعین نے اس کی بنیاد اپنے دست ہائے اقدس سے رکھی اور سب ہی نے ادارے کی بقاو سلامتی کے لیے خصوصی دعائیں فرمائی۔

جلالۃ العلم حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ کے اس قائم کردہ ادارے نے مختلف میدانوں اور شعبوں میں نہایت ہی سرعت و تیزی کے ساتھ دینی، علمی، تصنیفی،، دعوتی اور تنظیمی خدمات انجام دیا۔ اس ادارے کی سب سے نمایاں اور اہم خدمات اس کے وہ ابنا وفائین ہیں جو ملک و بیرون ملک میں اشاعتِ دین و شریعت کا کام بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

مرکز الثقافۃ السنیہ (کیرلا): یہ جنوبی ہند کا ایک عظیم الشان اور مسلکِ شافعی کا داعی و ترجمان ادارہ ہے جو ریاستِ کیرلا کے شہر کالی کٹ میں واقع ہے۔ اس کا سنگ بنیاد ۱۹۷۸ء میں مکہ معظمہ کے ایک عظیم عالم دین سید محمد ابن علوی مالکی رحمۃ اللہ علیہ کے مقدس ہاتھوں رکھا گیا۔ اس وقت یہ ادارہ عالم اسلام کے معروف و شہرت یافتہ عالم دین و داعی کبیر سیاح عرب و عجم شیخ ابوبکر ملسیار صاحب کی قیادت و سرپرستی میں شاہراہِ ترقی پر گامزن ہے۔

اس ادارے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ہندوستان میں اہلِ سنت و جماعت کا واحد ایسا ادارہ ہے جہاں پر دینی و عصری دونوں طرح کے علوم و فنون کی منظم تعلیمی ہوتی ہے۔ ہندوستان کے مدارسِ عربیہ میں عربی ادب کے فقدان کو دیکھتے ہوئے اس ادارے کی بنیاد خاص طور پر شعبۂ عربی پر رکھی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ملک بھر سے عربی ادب کے خواہش مند طلبا داخلے کے لیے یہاں کشاں کشاں چلے آتے ہیں اور یہاں سے ایک اچھے عربی ادیب بن کر نکلتے ہیں۔

اسی طرح ہر سال یہاں سے کثیر تعداد میں طلبا فارغ ہوتے ہیں اور ملک و بیرونِ ملک جاکر مختلف میدانوں میں تبلیغِ اسلام کا گراں بہا کام انجام دیتے ہیں۔

دار العلوم علیمیہ (جمداشاہی): تقسیمِ وطن کے بعد ہندوستان بھر میں جابجا مدارس و جامعات قائم ہوئے۔ اسی طرح دینی ضرورتوں کے تحت مبلغ اسلام علامہ عبد العلیم صدیقی میرٹھی علیہ الرحمۃ نے ۱۹۵۳ء میں "دار العلوم علیمیہ" جمداشاہی تعمیر فرمایا۔ یہ ادارہ ضلع بستی ہیڈ کوارٹر سے تقریباً ۱۵ کلومیٹر دور بستی بانسی شاہراہ کے نزدیک جمداشاہی گاؤں میں واقع ہے۔ (الشباب الاسلامی، سال نامہ علیمیہ ۲۰۰۳ء)

اس ادارے نے مبلغ اسلام علامہ عبد العلیم صدیقی میرٹھی علیہ الرحمۃ کے چھوڑے ہوئے دینی اور علمی مشن کو مزید آگے بڑھانے میں جو مؤثر کردار ادا کیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ آپ کے اندر دین و سنیت کے تئیں جو جذبات و احساسات تھے، اس ادارے نے اس کو روبہ عمل لانے میں آج تک کسی طرح کی کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ہزاروں کی تعداد میں آپ کی طرح ایسے ایسے سپاہیانِ اسلام تیار کیے جو عالمی سطح پر اسلام کے لیے سپر اور ڈھال کا کام کر رہے ہیں۔

مدارس کی اہمیت و ضرورت: یہ بات کون نہیں جانتا کہ ۱۸۵۷ء ہندی مسلمانوں کے لیے سخت ابتلا و آزمائش کا دور تھا۔ اسلام و مسلمین برطانوی سامراجیت کے زد پہ تھے۔ وہ ہندوستان سے مسلمانوں کو نیست و نابود اور اسلام کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس وقت بھی مدارسِ اسلامیہ ہی کے پروردہ و تعلیمی یافتہ مجاہدینِ اسلام نے اپنی جان پر کھیل کر ظالم و جابر برطانوی حکومت کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا تھا اور اسلام و مسلمین کا تحفظ کیا تھا۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم گاؤں گاؤں شہر شہر مدارس و جامعات اور مساجد و مکاتیب کا قیام عمل میں لائیں اور انہیں مسلم معاشرے کی بہتری کے لیے زیادہ سے زیادہ فروغ دیں، کیوں کہ یہ مدارس ہی ہیں جنہوں نے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہِ راست پر لانے کا ایک اہم دینی کام انجام دیا ہے۔

یہ مدارسِ اسلامیہ ہی کی دین ہے کہ قوم کے اندر حلال و حرام، نفع و نقصان اور اچھے و برے کے درمیان امتیاز و تفریق کرنے کی صلاحیت و اہلیت پیدا ہوئی۔ مدارس نے انہیں صحیح شعور و آگہی عطا کیا۔

یقیناً امتِ مسلمہ مدارس اسلامیہ اور اس کے فارغین کی مرہونِ منت ہے، جنہوں نے قومِ مسلمہ کی ہر ہر قدم پر دینی، فکری، نظریاتی اور سماجی طور پر رہنمائی کی ہے۔ ہر دور میں مسلمانوں میں دینی، فکری، سیاسی اور سماجی بیداری کے لیے مدارسِ اسلامیہ ہی مستعد و سرگرمِ عمل رہے ہیں۔

مدارسِ اسلامیہ کا ایک اور عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لوگوں کے مابین اتحاد و یکجہتی، امن و آشتی اور تحمل و رواداری کا پرچار کیا ہے۔ دین سے بے راہ رو لوگوں کو شمعِ علم و ایمان سے منور و تاباں کیا ہے، اس کے علاوہ قرآن و احادیث کے علوم و فنون اور اسرار و معارف کے فروغ و ارتقا اور اسلام کی دعوت و تبلیغ میں جو مؤثر اور اہم ترین کردار ادا کیا ہے وہ تاریخ کے صفحات پر سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ■■■

انوارِ حیات

مفتی غلام سرور لاہوری
حیات و خدمات

☆محمد ثاقب رضا قادری

مورخ لاہور رائے بہادر کنھیالال نے لکھا ہے کہ شاہانِ اسلام کے عہد میں شہر لاہور میں چار مفتی اور ایک قاضی مقرر تھا، ہر ایک مفتی چوتھے حصے شہر کا حاکم تصور کیا جاتا تھا، ہر ایک مقدمہ پہلے پہل مفتی کے اجلاس میں تکمیل پاکر بعد تحریر رائے و حکم محکمہ افتا کے قاضی کی خدمت میں بھیجا جاتا اور محکمہ قضا سے اس پر حکم اخیر نافذ ہوتا۔

(تاریخ لاہور: ۵۴)

عارف باللہ شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے خلف پنجم شیخ الاسلام شہاب الدین انور کی اولاد امجاد سے ایک عالم بے بدل فقیہ بے مثل مفتی مخدوم مشہور بہ میاں کلاں سلطان بہلول لودی کی دعوت پر لاہور تشریف لائے اور مسند افتاء پر رونق افروز ہوئے۔ لوگ آپ کا بے حد خلوص دل سے ادب و احترام کرتے تھے۔ علاقہ 'ہیبت پور پتی' (جس کو اب لوگ ''پٹی'' کہتے ہیں اور لاہور کے ضلع پرگنہ قصور میں واقع ہے) آپ کی جاگیر میں تھا، آپ نے محلہ علاول خان لوہانی (اندرون موچی دروازہ، لاہور) میں زمین زر خرید کرکے اپنا محلہ آباد کیا جو اب تک ''کوٹلی مفتیاں'' کے نام سے مشہور ہے۔ مورخین لاہور نے آپ کی لاہور تشریف آوری کا سال ذکر نہیں کیا اور نہ ہی عہدۂ افتا پر متمکّن رہنے کا عرصہ ذکر کیا ہے۔

حضرت میاں کلاں کا وصال ۸۹۱ھ میں ہو گیا تو آپ کے صاحب زادے شیخ مفتی کمال الدین قریشی نے آپ کی مسند سنبھال لی، آپ اپنے زمانہ کے عالم متبحر اور فقیہ کامل تھے، آپ نے کوٹلی مفتیاں میں ایک وسیع مسجد تعمیر کروائی جو کہ ''مسجد مفتیاں'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ آپ نے اسی مسجد کو درس و تدریس کا مرکز بنالیا، کثیر مخلوق آپ سے فیض یاب ہوئی۔ کئی پشتوں تک آپ کی اولاد سے اہل علم افراد نے مسند تدریس و افتا کو رونق بخشی، اپنے آبائی سلسلہ سہروردیہ کے فیض سے تشنگان علوم باطنیہ کے قلوب کو راحت بخشی، بیش قیمت علمی و تحقیقی کتب تصنیف کیں نیز فن طبابت سے لوگوں کو فیض پہنچایا۔

سکھ گردی کے دَور میں لاہور شہر برباد ہو گیا، خاندان مفتیاں کے بیشتر افراد نقل مکانی کرکے موضع منج چلے گئے لیکن اس آزمائش کے دَور میں بھی خاندان مفتیاں کی دو ذی علم شخصیات مفتی محمدی اور مفتی رحیم اللہ نے محلہ کوٹلی مفتیاں میں ہی سکونت اختیار کی اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا جب کہ شہر میں قحط پڑا تھا، سکھوں نے کئی بار ان کی حویلیوں کو لوٹا، مکان کی لکڑیاں تک اتار لے گئے، مسجد مفتیاں کی عمارت کو بھی شدید نقصان پہنچا لیکن ان جلیل القدر شخصیات کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں محلہ دوبارہ آباد ہوا، مسجد مفتیاں کی دوبارہ تعمیر بارے صلاح مشورہ جاری تھا کہ ایک شخص دلاور خان داروغہ اصطبل کنور نونہال سنگھ (پوتا راجہ رنجیت سنگھ) نے زبردستی مسجد کے صحن پر قبضہ کرکے اپنی حویلی تعمیر کرلی، جس کے سبب مسجد چھوٹی رہ گئی۔ (تحقیقات چشتی: ۱۷۳)/ ذکر جمیل: ۱۷)

معروف مصنف، محقق، مورخ، ادیب، شاعر، تذکرہ نویس، تاریخ گو، ماہر زبان، لغت نویس مفتی غلام سرور لاہوری (متوفی ۱۸۹۰ء) اسی خاندان مفتیاں کے چشم و چراغ تھے جن کی مایہ ناز تصانیف کے سبب خاندان کی نیک نامی کا شہرہ پورے برصغیر میں ہوا۔

مفتی غلام سرور لاہوری ۱۸۳۷ء/۱۲۴۴ھ کو مفتی غلام محمد کے ہاں محلہ کوٹلی مفتیاں لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب پندرہ واسطوں سے شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی علیہ الرحمۃ تک پہنچتا ہے۔ حدیقۃ الاولیاء میں مفتی صاحب نے اپنا شجرۂ نسب یوں لکھا ہے:

مفتی غلام سرور بن مفتی غلام محمد بن مفتی رحیم اللہ بن مفتی رحمت اللہ بن مفتی حافظ محمد تقی (۴) بن مفتی محمد تقی بن مولانا کمال الدین خرد بن مفتی عبدالسمیع بن مولانا عتیق اللہ بن مولانا برہان الدین بن مفتی محمد محمود بن شیخ الاسلام عبدالسلام بن شیخ عنایت اللہ بن مولانا کمال الدین بن شیخ مخدوم مشہور بہ میاں کلاں بن شیخ قطب الدین بن شیخ شہاب

الدین بن شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی قدس اسرارہم (حدیقۃ الاولیاء :۱۱۸)

خزینۃ الاصفیاء (مترجم) میں آپ نے اپنا شجرہ یوں بیان کیا ہے:

"مخفی نہ رہے کہ احقر غلام سرور (راقم السطور) بھی قطب الاقطاب بہاء الدین زکریا ملتانی کی کم ترین اولاد میں سے ہے۔ میرے آبائے کرام کی نسبت چند واسطوں سے شیخ شہاب الدین تک جا پہنچتی ہے جو حضرت کے پانچویں بیٹے تھے۔ مولوی مخدوم المشہور میاں کلاں بن شیخ جمعون بن شیخ قطب الدین بن شیخ شہاب الدین نے دارالامان شہر ملتان سے لاہور کی سمت سفر کیا اور پھر لاہور میں قیام فرمایا۔ اب تک حضرت مخدوم کی اولاد میں سے کئی لوگ (جیسے میرے چچا مفتی غلام رسول، میرے بھائی حافظ غلام احمد اور یہ فقیر سراپا تقصیر) اپنی اولاد اور بیٹوں کے ساتھ لاہور میں محلہ کوٹلی مفتیاں میں (جوان کا قدیم مسکن ہے) موجود ہیں۔ واللہ الباقی والکل فانی

(خزینۃ الاصفیاء مترجم، جلد چہارم، ص:۵۳)

تعلیم واساتذہ: آپ نے اپنے والد ماجد مفتی حکیم غلام محمد لاہوری سے علوم قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ و ادب، صرف و نحو، معانی و منطق، اصول و فروع اور تاریخ و لغت کی مکمل تعلیم حاصل کی اور اپنی شبانہ روز محنت سے ان علوم و فنون میں ممتاز حد تک مہارت تامہ حاصل کی۔ آپ کے والد گرامی نے فاضل اجل عالم بے بدل مولانا غلام رسول لاہوری اور مولانا غلام اللہ لاہوری علیہما الرحمۃ سے تعلیم حاصل کی۔

اس بارے مفتی صاحب اپنی کتاب مخزن حکمت میں لکھتے ہیں:

"راقم کے والد مفتی غلام محمد بھی ایک مرد خدا پرست و فاضل طبیب تھے، عام معالجہ تمام عمر انہوں نے جاری رکھا، آخر ۱۲۷۶ھ میں فوت ہوئے۔ انہوں نے علم کا فیض حضرت مولوی غلام رسول و غلام اللہ فاضلان لاہور سے حاصل کیا جن کے عام فیوض سے تمام زمانہ بہرہ یاب ہے، راقم نے تعلیم اپنے والد بزرگ وار سے پائی۔ اللھم اغفرہ" (مخزن حکمت:۱۴۸)

بیعت: اپنے آبائی سلسلہ سہروردیہ و قادریہ کے علاوہ ۱۸۹۰ء میں جب مفتی غلام سرور لاہوری سفر حج کو روانہ ہوئے، تو مکہ معظمہ میں شیخ الحرمین حاجی امداد اللہ چشتی صابری مہاجر مکی علیہ الرحمۃ کے ہاتھ پر سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی۔ آپ کے بھتیجے مفتی جلال الدین سہروردی بھی ہمراہ تھے انہوں نے بھی حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ (ذکر جمیل :۸۲)

مسلک: مفتی صاحب کی زندگی عشق رسول ﷺ سے عبارت تھی جس کا اندازہ ان کے حمدیہ و نعتیہ دواوین سے کیا جاسکتا ہے۔ غوث اعظم شیخ سید عبدالقادر جیلانی سے آپ کی عقیدت کا بیّن ثبوت مناقب غوثیہ پر مشتمل کتاب "دیوان سروری" ہے۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی علیہ الرحمۃ کے علمی و روحانی فیض کا یہ اثر تھا کہ نسل در نسل آپ کے خاندان کے چنیدہ افراد مسند افتا پر متمکّن رہے نیز علوم قرآن و حدیث و فقہ و طب کی آبیاری کرتے رہے اور روحانی اعتبار سے سلسلہ سہروردیہ کے ذریعہ عوام و خواص کو فیض باطنی سے آراستہ کرتے رہے۔ آپ کا جملہ خاندان حنفی المذہب تھا اور برصغیر میں جنم لینے والے گروہی و مسلکی اختلاف سے کنارہ کش رہا۔

مفتی محمود عالم ہاشمی لکھتے ہیں: "آپ کے خاندان کے تمام بزرگ اہل سنت حنفی المذہب، مفتی وقت اور جامع شریعت و طریقت ہوئے ہیں اور اصلاح باطن کے صوفیانہ طریقوں کو آپ کے خاندان میں ہمیشہ ممتاز جگہ حاصل رہی ہے۔" (ذکر جمیل :۱۰۶)

خدمات: مفتی صاحب کی تمام زندگی ہمہ وقت تحریک سے عبارت ہے، آپ نے اپنی آبائی مسند مسجد مفتیان کو رونق بخشی اور ساری زندگی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ نیز گراں قدر تصانیف رقم فرمائیں جن کی سبب پورے برصغیر میں آپ کا شہرہ ہوا۔ آپ نے خاص کر شاعری، تاریخ صوفیہ، تاریخ گوئی اور لغت نویسی پر تحقیقی کام کیا۔

اگر فن شاعری میں آپ کی خدمات کو دیکھا جائے تو اردو زبان میں پہلا حمدیہ دیوان آپ ہی نے تصنیف کیا، نیز نعت و منقبت اور تاریخ گوئی میں آپ کو کمال ملکہ حاصل تھا، اس لحاظ سے آپ کی تصانیف کا مکمل تعارف آگے آرہا ہے۔ تاریخ گوئی میں آپ کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ آپ نے دَور رسالت مآب ﷺ سے لے کر اپنے عہد تک اہم شخصیات کی تاریخ ولادت و وصال پر فارسی زبان میں قطعات تواریخ رقم کیے ہیں اور ہر شخصیت کا تعارف اختصار کے ساتھ حاشیہ میں لکھا ہے، یوں یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد تصنیف ہے۔

مفتی صاحب نے بہاریہ غزلیں بھی لکھیں لیکن مفتی محمد انور کے بہ قول مولانا نے عاشقانہ شاعری کا مکمل دیوان اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے دریا میں ڈبو دیا تاکہ ان کے بعد ان کا نعتیہ کلام ہی باقی رہے۔ (کلیات نعت سرور:۲)

اردو زبان کے فروغ کے لیے آپ نے انشاء اور لغت پر دو دو کتب تصنیف کیں جو کہ اپنی مثال آپ ہیں۔ تذکرہ و تاریخ نویسی کے

میدان میں اگر آپ کی خدمات کو دیکھا جائے تو پنجاب کے قدیم علماء و صوفیہ کے متعلق آپ کی کتب سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

معاصر اہل علم سے روابط: آپ کے عہد میں شہر لاہور اہل علم و فضل کا مرجع و محور رہا ہے، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، مفتی غلام محمد بگوی، مفتی غلام دستگیر قصوری، مولانا غلام قادر بھیروی، حافظ ولی اللہ لاہوری، جیسی شخصیات لاہور کو اپنے علمی فیوض و برکات سے سیراب کر رہی تھیں۔

ان کے علاوہ برصغیر کی کثیر علمی و ادبی شخصیات سے آپ کے قریبی روابط تھے جیسا کہ آپ کی کتب پر ارباب علم کے قطعات تواریخ و تقاریظ سے اندازہ ہوتا ہے چناں چہ چند نام درج ذیل ہیں:

سید مرشد علی گیلانی میدنی پوری متخلص بہ عاصی، سید مرتضیٰ ارنڈولی، میر حسام الدین خاندیسی، مفتی چراغ دین لاہور (مولف کتاب سراج الحساب)، ڈاکٹر سید علی شاہ متخلص بہ الفت لاہوری، مورخ لاہور رائے بہادر کنھیالال متخلص بہ ہندی، لالہ سیورام متخلص بہ گوہر، مولوی محمد علی متخلص بہ پُردل خلف مولوی یکدل، منشی درگا پرشاد (مصنف خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم و مراۃ خیالی و غیرت گلزار، گلدستہ اخلاق و نکات الحساب)، شاہ بہاؤ الدین دہلوی متخلص بہ بشیر، سید عبدالرسول ساکن ارنڈول۔

کنھیالال کی کئی کتب پر آپ کے قطعات تواریخ بھی ملتے ہیں۔

آپ کی طبیعت میں حد درجہ استغناء تھا، اہل ثروت اور ارباب سیاست سے ہمیشہ کنارہ کش رہتے، پنڈت بیج ناتھ، فقیر شمس الدین اور ڈاکٹر لائٹنر (رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی) نے کئی بار کوشش کی کہ آپ ایسے فاضل مصنف کی حکومت کو بے حد ضرورت ہے نیز حکومت آپ سے متعدّد کتب مختلف علوم پر لکھوانا چاہتی ہے، اس ضمن میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کی مثالیں دے کر قائل کرنے کی کوشش کی مگر آپ نے فرمایا؛

"نہ تو مجھے خطاب و جاگیر کی ضرورت ہے اور نہ میں اپنی تصانیف کو حکومت کے زیر اثر لکھنا چاہتا ہوں، ان لوگوں کی تصنیف و تالیف کا مقصد کچھ اور ہے اور میرا راستہ ان سے الگ ہے۔"

ڈاکٹر لائٹنر کے اصرار کے باوجود پنجاب یونیورسٹی کا اعزازی فیلو بننا بھی منظور نہ کیا۔

۱۸۸۴ء میں سرسید نے علی گڑھ کالج کی مالی امداد کے لیے پنجاب کا دورہ کیا اور اپنے دیرینہ دوست خان بہادر ڈپٹی برکت علی کے ہاں قیام کیا۔ ڈپٹی برکت علی نے اکابر لاہور کو اپنی رہائش گاہ واقع بیرون موچی دروازہ میں بلایا، مفتی صاحب کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ ڈپٹی صاحب نے سرسید کو آپ کا تعارف کروایا، سرسید آپ کی ذات سے بڑے متاثر ہوئے، اور اپنے مشن میں شمولیت کے لیے پیش کش کی لیکن مفتی صاحب نے فرمایا:

"سید صاحب میں اس کام کے لیے موزوں نہیں ہوں، میرا شغل تصنیف و تالیف ہے۔ آپ نے جن لوگوں کی جماعت اپنے گرد اکٹھی کر لی ہے، وہ اس مقصد کے لیے بہت موزوں ہے، اور پھر جماعتی اتحاد کے لیے عقائد کے اتحاد کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور (میں) یہ چیزیں یہاں نہیں دیکھتا۔"

سرسید آپ کا یہ جواب سن کر خاموش ہو گئے۔ (ذکر جمیل:۱۱۱)

تصانیف:

۱۔ دیوان حمد ایزدی: یوں تو شعراء نے حمدیہ کلام بھی کثرت سے لکھا ہے لیکن اردو زبان میں حمد کا غالباً یہ پہلا دیوان ہے جو کہ مفتی غلام سرور لاہوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ۱۲۹۷ھ/ میں مطبع وکٹوریا پریس لاہور سے شائع کروایا۔ مفتی صاحب اس دیوان کے بارے لکھتے ہیں:

"اس دیوان میں خداوند حقیقی کی حمد و مضامین سلوک و تصوف و ترک خلائق دنیائے ناپائیدار و پند و نصائح و ترغیب بعبادت معبود وغیرہ مضامین مفیدہ میں حسب سفارش و ارشاد محب صداقت آگیں شیخ انام الدین حکیم مدح خوان رسول کریم لکھا گیا اور دیوان حمد ایزدی نام رکھا گیا ہے۔ خداوند تعالیٰ میرے اس کلام کو مقبول کرے اور شائقین باتمکین اس کے مضامین سے ظاہری و باطنی فائدہ پائیں حظ اٹھائیں۔ یہ دیوان بھی احباب کی امداد سے چھپ کر مفت تقسیم ہوا۔" (دیوان حمد ایزدی: ۴)

یہ دیوان خان بہادر محمد شاہ آنریری مجسٹریٹ امرت سر، سید حیدر علی شاہ (سپروائزر انہار)، میاں کریم بخش صاحب ٹھیکہ دار لاہور، سید علی عبدالقادر شمس القادری مرشد علی گیلانی قادری میدنی بنگالی، منشی چراغ دین صاحب (مالک وکٹوریا پریس لاہور)، بابو غلام محی الدین صاحب اور سید رجب علی شاہ صاحب (سپرنٹنڈنٹ و مہتمم مطبع وکٹوریا پریس لاہور) کے تعاون سے چھپا اور تقسیم ہوا۔

۲۔ نعت سروری: اردو و فارسی نعتیہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ چھ بار لاہور اور ایک دفعہ لکھنو سے شائع ہوئی کل صفحات ۳۸۸ ہیں۔ آپ

کی نعتیہ غزلوں کا ایک مجموعہ بنام ''دیوان کلیات نعت سرور'' مکتبہ اسلامیہ سٹیم پریس، لاہور سے مفتی محمد انور کے اہتمام سے شائع ہوا۔

۳۔ خزینۃ الاصفیاء: یہ کتاب مفتی صاحب کا ایک عظیم کارنامہ ہے، تراجم صوفیہ پر لکھی گئی کتب میں اس کتاب کو اہم ماخذ کا درجہ حاصل ہے۔ اس سے قبل اس قدر جامع اور وقیع کام تراجم صوفیہ پر منظر عام پر نہ آیا تھا۔ مولانا نے نہایت تحقیق و تدقیق سے تاریخی روایتوں کا جائزہ لیا اور ۱۱۸۰/ صفحات پر یہ کتاب کامل ایک سال کی محنت سے ترتیب دی۔ اصل کتاب فارسی زبان میں کل دو جلدوں پر مشتمل ہے، اس کا اردو ترجمہ مفتی محمود عالم ہاشمی اور پیرزادہ اقبال فاروقی نے پانچ جلدوں میں مکتبہ نبویہ نے شائع کیا۔ یہ کتاب سات مخزنوں پر مشتمل ہے جس کی تفصیل یوں ہے:

مخزن اول: رسول کریم ﷺ، خلفائے راشدین وائمہ دین کا ذکر
مخزن دوم: مشایخ خاندان قادریہ کے بیان میں
مخزن سوم: خانوادۂ چشت اہل بہشت کے بیان میں
مخزن چہارم: سلسلہ عالیہ نقش بندیہ مجددیہ کے مشایخ کے بیان میں
مخزن پنجم: بزرگان سہروردیہ کے بیان میں
مخزن ششم: متفرق خانوادوں اور مشایخ کے تذکرہ میں
مخزن ہفتم: اس کے کل چار حصے ہیں۔ حصہ اول میں ازواج مطہرات سرور کائنات کا بیان، حصہ دوم میں حضور نبی کریم ﷺ کی اولاد کا بیان، حصہ سوم میں صالح عورات وعارفات کا ذکر اور حصہ چہارم میں مجانین ومجاذیب کا بیان ہے۔

یوں اس کتاب میں تقریباً گیارہ سو (۱۱۰۰) بزرگان دین کے حالات درج ہوئے ہیں، نیز ہر بزرگ کی تاریخ ولادت و وصال کے متعلق تاریخ قطعہ بھی کہا گیا ہے۔

۴۔ دیوان وصال سرور: یہ دیوان اثناء سفر حج کعبہ میں مفتی غلام سرور لاہوری نے تصنیف کیا اس میں چند نعتیہ غزلیں التجائی بہ حضور جناب رسول الثقلین ﷺ شامل ہیں۔ مفتی غلام صفدر کے بہ قول مصنف مرحوم نے اس کا نام ''حضوری غزلیں'' رکھا تھا کیوں کہ مصنف کا منشایہ تھا کہ مدینہ شریف جاکر وہاں روضۂ انور کے سامنے پڑھیں گے۔ نعتیہ غزلوں کے علاوہ فرائض واحکام حج بھی نثر میں تحریر کیے۔ مفتی غلام صفدر نے اس کا نام ''وصال سرور'' رکھا، مصنف مرحوم نے دیباچہ اس انداز میں تحریر کیا ہے کہ گویا ان کو مدینہ شریف حاضری کی سعادت میسر آئی اور بارگاہ مصطفی علیہ التحیۃ والثنا پر التجائیہ غزلیں پڑھنے کا موقع ملا، اگرچہ ان کو مدینہ شریف حاضری کی سعادت نہ ملی اور کچھ فاصلہ پر ہی مقام بدر پر وصال ہو گیا۔ مفتی غلام صفدر نے ابتدائی ۳۲ صفحات پر مفتی صاحب کی تصنیفات کا مختصر تعارف اور شجرۂ نسب بیان کیا ہے نیز مفتی صاحب کے کچھ خطوط بھی نقل کیے ہیں۔ اس کے بعد مفتی صاحب کا تحریر کردہ دیباچہ ہے پھر تمام ردیفوں میں حضوری غزلیں لکھی گئی ہیں اور اس کے بعد حج کے فرائض کا بیان ہے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ مطبع صدیقی، فیروز پور سے شائع ہوئی۔ بعد ازاں کلیات نعت سروری میں اس کو شامل کر دیا گیا۔

۵۔ دیوان سروری: حضور شیخ عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانی رضی اللہ عنہ کی مناقب پر مشتمل یہ دیوان (۵۲ صفحات) دوسری مرتبہ ۱۲۹۰ھ میں مطبع وکٹوریہ پریس لاہور سے شائع ہوا۔ اس کی اول اشاعت شیخ عزیزالدین لاہوری نے کی، سات سو کی تعداد میں شائع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ شائقین حضور غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں تقسیم ہو گئی چنانچہ احباب کے پُرزور اصرار پر دوسری بار طباعت کا اہتمام کیا گیا۔ یہ دیوان ۷۷ مناقب غوثیہ پر مشتمل ہے، آخر میں ایک قصیدہ حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ کے حلیہ مبارک پر ہے۔ ردیف دال کی ایک منقبت کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

دیوان کے آخر میں قطعات تاریخ طبع زاد سید علی شاہ لاہوری المتخلص بہ اُلفت (ہمشیرہ زاد و شاگرد مفتی غلام سرور لاہوری)، مفتی غلام صفدر، لالہ سیورام گوہر، مولوی محمد علی پُردل (خلف مولوی یکدل لاہوری) نقل ہیں۔

۶۔ تحفۂ سروری: اس منظوم کتاب میں مفتی صاحب نے اعضاء کی عبادات و آداب کا بیان کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں حمد اور نعت کے بعد مفتی صاحب نے اجمالی طور پر اپنے والد گرامی مفتی غلام محمد لاہوری کا تعارف کروایا ہے۔ اس کے بعد کتاب ہذا کی تاریخ کا استخراج کیا ہے۔ کتاب کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ عبادت و خاکساری و عجز و نیاز کے فوائد کے بیان میں ہے جس کے ذیل میں عبادت دل و ذکر خفی و تصور ذات باری، سر، آنکھ کی عبادت، ترک خودبینی و نظر بد و حصول شرم وحیا، ذکر عبادت زبان و ترغیب صدق و راستی و ترک کذب و دروغ، کان، ہاتھ اور پاؤں کی عبادت کا بیان ہے۔

دوسرے حصہ میں زندگی کی بے اعتباری کا بیان ہے جس کے ذیل

میں علم وعمل کی ترغیب دی گئی ہے۔ خیرات کے بیان میں تعمیر مسجد و مدرسہ، سرائے و مسافر خانہ، آبادی شہر، اجرائے نہر، بنائے چاہ (کنواں)، تالاب وپُل، شفاخانہ، مقابر اولیاء اللہ، سرراہ درخت لگانا، رستوں کی تعمیر و ترقی اور تالیف و تصنیف کتب ایسے اعمال کا ترغیبی بیان ہے۔ تیسرا باب نیک نامی کے حاصل کرنے اور گم نامی ترک کرنے کے بیان پر مشتمل ہے۔ چوتھے باب میں حسن کلام و آداب تقریر اور ہرزہ گوئی کے ترک کی ترغیب دی گئی ہے۔ پانچواں باب مروّت واحسان بخلق خدا و خبر گیری فقرا و غربا کا بیان ہے۔ چھٹا باب توبہ کرنے اور گناہ پر ندامت و پشیمانی کا بیان ہے۔ ساتواں باب اتفاق و ہم دردی کے فوائد اور نفاق و تعصب و عداوت کے نقصانات کے بیان پر مشتمل ہے۔

مفتی غلام حیدر لاہوری، مفتی محمد انور لاہوری، علی عبدالقادر شمس القادری سید مرشد علی گیلانی میدنی پوری تخلص عاصی، سید مرتضیٰ المعروف بچو میاں، مفتی محمد اصغر اور مفتی چراغ الدین لاہوری نے قطعات تواریخ رقم کیے جو کہ کتاب کے آخر میں درج ہیں۔ یہ کتاب (۱۴۰ صفحات) مطبع نامی نول کشور (لکھنؤ) سے فروری ۱۸۸۱ء/ربیع الاول ۱۲۹۸ھ میں طبع ہوئی۔

۷۔ گلشن سروری: یہ منظوم کتاب (۹۲ صفحات) مطبع مصطفائی لاہور سے ۱۲۹۱ھ/میں شائع ہوئی۔ اس منظوم رسالہ کو مفتی صاحب نے پینتیس (۳۵) ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب خدا کی عبادت و بندگی کے بیان میں، دوسرا تسلیم و رضا، تیسرا خدا کے حقوق، حقوق والدین، استاد اور مرشد کی خدمت کا بیان، اولاد کی پرورش کا بیان، محبت و اُلفت کا بیان، تواضع کا بیان، ذوی القربیٰ کی خبر گیری کا بیان، دوستی، آداب مہمان نوازی، ہمسایہ کی خبر گیری و دل داری، یتیم کی پرورش اور مروت کا بیان، مسکین و مسافر کی حق رسی، صبر و قناعت، وفا کے فوائد میں، عدالت و انصاف، عفت و پارسائی، شکر و حق شناسی کے بیان میں، عفو، صدق و راستی، دیانت و امانت، شجاعت و دل آوری، سخاوت کے فوائد، علم و ہنر و تامل کے فوائد، حق صحبت کا بیان اور ان لوگوں کا بیان جن کی صحبت اختیار کرنی چاہیے اور جن کی صحبت سے گریز کرنا چاہیے۔ ان اقوام کی تشریح جن سے پرہیز واجب ہے۔ سوال کے بیان، بادشاہ و فوج کے حقوق کا بیان، حقوق رعیت بر شاہ کے بیان میں اور آخری باب حق شوہر کے بیان پر مشتمل ہے۔

حسب معمول مفتی صاحب کی کتاب کے آخر میں قطعات تاریخ ہیں جو کہ انور حسین لاہوری، مفتی غلام صفدر لاہوری، مفتی غلام اکبر اور سید علی شاہ کے طبع زاد ہیں۔ ان قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا سن تالیف ۱۲۸۹ھ ہے جبکہ سن طباعت ۱۲۹۱ھ ہے۔

۸۔ گلدستۂ کرامات (ترجمہ مناقب غوثیہ):

یہ کتاب در حقیقت شیخ محمد صادق شیبانی کی فارسی کتاب "مناقب غوثیہ" کا عام فہم اردو ترجمہ ہے لہذا اس کو مولانا کی تصانیف میں شمار کرنا درست نہیں، مولانا نے خود کتاب کے دیباچہ میں صفحہ ۲۴ پر اسے شیخ صادق شیبانی کی کتاب کا ترجمہ لکھا ہے۔ البتہ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مولانا نے ترجمہ کرتے ہوئے کتاب میں جگہ جگہ اردو و فارسی حضور غوث پاک سید عبدالقادر جیلانی کے مناقب پر مشتمل غزلیں، قطعات اور دیگر اشعار کا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب میں حضور شیخ عبدالقادر جیلانی کی عمر مبارک ۹۱ سال کی نسبت سے کل ۹۱ کرامات بیان کی گئی ہیں۔ کچھ کرامات کا اضافہ فاضل مترجم نے دیگر مستند کتب سے بھی کیا ہے چناں چہ اس کا ذکر مترجم نے کتاب کے آخیر میں بدیں الفاظ کیا ہے:

"یہ عاصی پُر معاصی اگر چہ مرید خاک بوس آستان فیض توامان خاندان عالی شاہ نقش بندیہ مجددیہ ہے مگر محض بہ سبب ارادت و اعتقاد دلی کے کہ عاصی کو بہ جناب والا خطاب غوثیہ ہے -کمر ہمت چست باندھ کر اس کار خیر میں مصروف ہوا کہ بہ روز حشر و نشر ارادت مندان غوثیہ میں شمار ہو کر اس غریق دریائے عصیان کا بیڑا پار ہو، اور یہ کتاب اگر چہ ترجمہ مناقب غوثیہ ہے مگر عاصی نے قطع نظر کتاب مذکور سے اور کتب والا رتبت سے بھی کرامات آں حضرت کے انتخاب کر کے درج اس کتاب کرامت مآب کے کیے ہیں اور یہ نالائق اگر چہ فن شعر اور شاعری میں ہر گز لیاقت نہیں رکھتا مگر محض برائے محبت دلی و جوش درونی اپنے کے چند مناجات تعریفی و مدح توصیفی حضرت غوثیہ لکھ کر چون گل تازہ درج گلدستہ ہذا کر دی گئیں۔" (گلدستہ کرامات:۱۹۱)

یہ کتاب متعدّد مرتبہ شائع ہوئی۔ حال ہی میں مکتبہ اشرفیہ، شیخوپورہ سے عکسی طور پر شائع ہوئی، پیرزادہ اقبال احمد فاروقی مرحوم نے یہ نسخہ اپنے دستخط کے ساتھ فقیر کو ۲۰۱۲۔۱۲۔۲۹ کو عنایت کیا۔

۹۔ گنجینۂ سروری معروف باسم تاریخی گنج تاریخ:

یہ ایک نہایت منفرد کتاب ہے، جس میں فاضل مصنف نے دور رسالت مآب ﷺ سے تادم تصنیف مذہبی شخصیات مثلاً صحابہ کرام، ائمہ اطہار، اولیائے کرام، علما و مشائخ عظام و امرا و سلاطین کی تاریخ ولادت و وصال بارے فارسی زبان میں قطعات تاریخ رقم کیے ہیں۔

گنج اول میں حضور اکرم ﷺ، صحابہ کرام و امامان کرام، گنج ثانی میں اولیائے قادریہ، گنج ثالث میں اولیاے چشت، گنج چہارم میں اولیاے نقشبند، گنج پنجم میں اولیاے سہرورد، گنج ششم میں متفرق عارفات و نسا، گنج ہفتم میں بادشاہان و سلاطین، گنج ہشتم بارہ حصوں پر مشتمل ہے جس کی تفصیل یوں ہے: حصہ اول خلفائے بنی امیہ، حصہ دوم خلفاے بنی عباس، حصہ سوم شاہان غزنوی، حصہ چہارم شاہان غوریہ، پنجم شاہان خلجیہ، حصہ ششم شاہان تغلقیہ، حصہ ہفتم شاہان خضر خانیہ، حصہ ہشتم شاہان نودیہ، حصہ نہم شاہان چنگیزیہ و تیموریہ چغتائیہ، حصہ دہم شاہان و حکام متفرقات، حصہ یازدہم امراے بلند اقتدار اور حصہ دوازدہم شعرائے روزگار کے وصال پر قطعات رقم فرماے ہیں۔ قطعات کے علاوہ ہر شخصیت کا مختصر تعارف حواشی میں درج کیا ہے۔

یہ کتاب مطبع نامی نول کشور، لکھنؤ سے نومبر ۱۸۸۹ء/ربیع الاول ۱۳۰۷ھ سے بار دوم طبع ہوئی۔

۱۰۔ حدیقۃ الاولیاء:

مفتی صاحب نے اس کتاب کی وجہ تالیف کی بابت لکھا ہے:

''میرے واثق محبان قدیم صادق دوستان صمیم امام الدین حکیم مدح خوان رسول کریم میرے مکلف حال ہوئے کہ ایک مجموعہ مختصر اردو زبان میں لکھو کہ جس میں ملک پنجاب کے اولیاء کا حال ہو یعنی دہلی سے پشاور تک جس قدر علاقہ اس وقت پنجاب کے ساتھ متعلق ہے اور مشہور اولیاء کے مزار اس میں ہیں، سب کا حال ضروری ضروری اس میں تحریر ہو۔ پس ایک دوست کے فرمانے اور دلی محبت نے جو قدیم سے مجھ کو اولیاے اللہ کے ساتھ ہے اس کام پر مجھ کو آمادہ کیا۔'' (حدیقۃ الاولیاء :۴۴)

فاضل مصنف نے کتاب کو سات چمن میں تقسیم کیا ہے، پہلا چمن مشائخ قادریہ، دوسرا چمن مشائخ چشتیہ، تیسرا چمن مشائخ نقشبندیہ، چوتھا چمن مشائخ سہروردیہ، پانچواں چمن مشائخ متفرقات، چھٹا چمن مجانین و مجاذیب اور ساتواں چمن عورات صالحات کے احوال پر مشتمل ہے۔

کتاب کے آخر میں فاضل مولف لکھتے ہیں:

''الحمدللہ والمنۃ کہ یہ حدیقہ بے خار و گلزار تازہ بہار بہ فضل کردگار یعنی تذکرہ ابرار فی اخبار حضرات الاخیار عین موسم کے وقت میں پھل پھول پر آیا۔ مولف نے اپنا دلی مطلب پایا۔ مقام شکر و تسلیم ہے کہ خداوند کریم نے مجھ عاصی روسیاہ گنہ گار کو اپنے دوستوں کا مشتاق بنایا ہے، محبت کا راستہ دکھلایا ہے اور یہ توفیق دی ہے کہ میں کسی قدر اپنے وقت عزیز کو حضرات اولیا کے ذکر میں صرف کروں اور ان کی اُلفت سے بہرہ پاؤں اگرچہ میں ناکارہ کجا اور یہ کار کجا مگر یہ شوق مجھ کو صرف حضرت غوث الثقلین محبوب سبحانی قطب ربانی سید سلطان محی الدین عبدالقادر جیلانی کی محبت میں حاصل ہوا اور محض یہ حضرت محبوب کی توجہ ہے کہ مجھ بے کار آدمی سے ایسے ایسے کار سرزد ہونے لگے بل کہ ایک عاجز ناتواں کو یہ قوت بخشی گئی کہ پہلے اس سے (یعنی حدیقۃ الاولیاء سے قبل) اسّی (۸۰) جزو کی کتاب خزینۃ الاصفیاء نام بزرگوں کے حال میں لکھی اور ہر ایک بزرگ کے ذکر کے خاتمہ پر تاریخی مادہ بھی لکھے مگر وہ کتاب فارسی اور بہت بڑی تھی اور شائقین ملک پنجاب کا یہ مطلب حاصل نہیں ہوتا تھا کہ کتنے بزرگ پنجاب کے ملک میں صاحب طریقت گزرے ہیں، اب اس مختصر اردو زبان کی کتاب لکھنے میں وہ دقت رفع ہوگئی۔ خداوند تعالیٰ مجھ کو اور تمام مسلمان بھائیوں کو اولیاء اللہ کی محبت کا شائق کرے اور خدا کرے کہ اس زمانہ میں کوئی ایسا ہادی پیر طریقت مل جائے کہ اس کی رہ نمائی سے میرے جیسے گم راہ راہ پر آئیں۔ خدا کی محبت کا راستہ پائیں لیکن اب یہ لوگ عنقا ہو گئے ہیں اور محبت کا حرف لوگوں کے لوح سینہ سے حک ہو گیا ہے، باطنی تو کجا ظاہری محبت کا بھی نام و نشان باقی نہیں رہا۔ (حدیقۃ الاولیاء (قدیم):۱۶۹-۱۷۰)

یہ کتاب لاہور سے پہلی بار ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی پھر مطبع نامی منشی نول کشور، کان پور سے دوسری بار جولائی ۱۸۷۷ء/جمادی الآخر ۱۲۹۴ھ اور تیسری بار ۱۸۸۹ء میں طبع ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ سے چوتھی بار طبع ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد پروفیسر محمد اقبال مجددی کی تحقیق مع اضافی حواشی و تعلیقات کے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی، پھر اسی کا دوسرا ایڈیشن تصوف فاؤنڈیشن، لاہور نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔ پروگریسو بکس، لاہور نے اسی کا تیسرا ایڈیشن جدید کمپیوٹر کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا ہے لیکن پروف ریڈنگ پر خاص توجہ نہیں دی گئی لہذا یہ جدید اشاعت باوجود ظاہری حسن کے کئی اغلاط کا مرقع ہے۔

اس کتاب کی افادیت اور اہمیت بارے پروفیسر اقبال مجددی لکھتے ہیں: ''پنجاب کے بعض مشائخ کے حالات صرف اسی حدیقۃ الاولیاء میں ملتے ہیں، مفتی صاحب سے پہلے کے مصنفین نے ان کے حالات نہیں لکھے۔'' (حدیقۃ الاولیاء محشی صفحہ:۳۸)

۱۱۔ بہارستان تاریخ معروف بہ گلزار شاہی:

یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے ہر حصے کو مزید ذیلی حصوں (چمن) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں ہندوستان کے راجوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ حصہ دو چمنوں میں منقسم ہے، چمن اول میں ہندوستانی مہاراجگان متقدمین، خاندان مہاراجگان سورج بنسی، خاندان چندر بنسی، راجہ پریچھتہ بن ابھمن، راجہ جنمیی سے راجہ پتھورا تک مختلف راجاؤں کا ذکر ہے۔ دوسرے چمن میں ہندوستان کی تقریباً ۷۲ ریاستوں کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً ریاست کوہ نیپال، کوہ جموں و کشمیر، پٹیالہ، نابھہ، کلیسا، فرید کوٹ، کپور تھلہ، راج کانگڑ، کوہ کلوو غیرہ

کتاب کا دوسرا حصہ مسلمان بادشاہان کے حال پر مشتمل ہے، اس حصہ میں کل ۵۳ چمن ہیں جن کی تفصیل یوں ہے:

چمن اول میں حضور نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد کا بیان ہے۔ چمن دوم میں خاندان بنی امیہ، چمن سوم میں خلفائے عباسیہ، چوتھے چمن میں شاہان بنی امیہ ملک اندلس، پانچواں چمن مورادی سلطنت، چھٹا چمن سلاطین غرناطہ، ساتواں چمن خلفائے مصر، آٹھواں چمن ملوک طاہریہ، نواں چمن ملوک ال لیث، دسواں چمن سامانی سلطنت اور اس کے عمائدین کے بیان میں، گیارہواں چمن ملوک غزنویہ، بارہواں چمن سلطنت آل بویہ، تیرہواں چمن سلاطین اسماعیلیہ فاطمیہ، چودہواں چمن خاندان ایوبیہ کردیہ، پندرہواں چمن سلاطین ملاحدہ قہستان، سولہواں چمن سلاطین سلجوقیہ، سترہواں چمن سلاطین خوارزم شاہی، اٹھارواں چمن سلاطین فراختائی، انیسواں چمن سلاطین آل مظفر، بیسواں چمن سلاطین اتابک، اکیسواں چمن سلاطین غوریہ، بائیسواں چمن سلاطین سیستان، تئیسواں چمن سلاطین کرت، چوبیسواں چمن سلاطین مغول تاتاری، پچیسواں چمن سلاطین سربداری، چھبیسواں چمن سلاطین خلجیہ، ستائیسواں چمن شاہان تغلقیہ، اٹھائیسواں چمن شاہان خضر خانیہ، انتیسواں چمن سلاطین لودیہ، تیسواں چمن شاہان بہمنی، اکتیسواں چمن سلاطین عادل شاہی، بتیسواں چمن خاندان نظام شاہی، چمن ۳۳ میں خاندان قطب شاہی، چمن ۳۴ میں شاہان یزید شاہی، چمن ۳۵ خاندان عماد شاہی، چمن ۳۶ میں بادشاہان گجرات، چمن ۳۷ میں شاہان غوری و خلجیہ مالوی، چمن ۳۸ میں شاہان فاروقی، چمن ۳۹ میں شاہان بنگالہ، چمن ۴۰ میں سلاطین مشرقی جونپوری، چمن ۴۱ میں شاہان سندھ ٹھٹھہ، چمن ۴۲ میں شاہان ملتان، چمن ۴۳ میں شاہان کشمیر، چمن ۴۴ میں شاہان بابریہ، چمن ۴۵ میں شاہان سورافغان، چمن ۴۶ میں سلاطین صفویہ، چمن ۴۷ میں سلاطین قراقونیلو، چمن ۴۸ میں سلطان آق نیلو، چمن ۴۹ میں سلاطین قاجا، چمن ۵۰ میں خاندان خیوق، چمن ۵۱ میں سلاطین عثمانیہ رومیہ، چمن ۵۲ میں شاہان ابدالی کے بیان پر مشتمل ہیں، چمن ۵۳ میں ہند کی مسلمان ریاستوں کا بیان ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ شاہان انگریز کے حالات پر مشتمل ہے۔

حمد اور نعت کے بعد فاضل مصنف لکھتے ہیں:

"اگرچہ پہلے بھی سلاطین روے زمین کے ذکر سے صدہا کتابیں سینکڑوں تاریخیں مورخان سلف بہ زبان عربی و فارسی وغیرہ لکھ چکے ہیں مگر بہ سبب طوالت ان کے بیان اور وسعت کتاب کے شائق کی طبیعت دیکھتے ہی گھبراتی ہے اور اس قدر طول وطویل کتاب کے دیکھنے کو ایک مشکل کام وہ تصور کرکے اس کے مطالعہ سے دست بردار ہوجاتا ہے، اس واسطے بندۂ نحیف و مور ضعیف غلام سرور نے ان تاریخوں کا خلاصہ کرکے یہ چھوٹا سا مجموعہ لکھا اور وہ مشکل کہ شائقین تواریخ کو بڑی کتابوں کے مطالعہ میں پڑتی تھی -رفع کردی۔" (بہارستان تاریخ: ۳)

یہ کتاب کل ۶۴۲ صفحات پر مشتمل ہے، دوبار لاہور اور ایک بار لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ ہمارے پیش نظر بار دوم مطبع نامی منشی نول کشور کا نسخہ ہے۔

۱۲۔ زبدۃ اللغات یا لغات سروری: فاضل مصنف لکھتے ہیں:

"ارادہ ہوا کہ ایک مفید نسخہ لغت کے علم میں ایسی طرز سے لکھا جائے کہ شعرا کو قافیہ و ردیف میں مدد دے اور شائقین لغت کو لغت میں اور ردیف ہر ایک لغت کے اخیر حرف پر رکھی جائے۔ پہلے حرف کی ردیف کی تغیر و تبدل کا بھی از روے حروف تہجی لحاظ رہے، فارسی و عربی کے لغات معانی اردو زبان میں تحریر ہوں۔ چناں چہ چند سال کی محنت کے بعد یہ مفید نسخہ تحریر میں آیا اور بڑی بڑی کتابوں برہان قاطع و غیاث اللغات و منتخب و رشیدی و صراح سے لغات انتخاب ہوکر اس میں درج ہوئی اور لغات سروری نام رکھا گیا اور اٹھائیس باب پر اس کی تقسیم عمل میں آئی، فصلیں ہر ایک باب کے پہلے حروف تہجی کی رعایت سے علاحدہ علاحدہ قرار پائیں اور ابواب اخیر حروف کے شمار پر قائم ہوئے اور نشان ہر ایک زبان کا ہر ایک لغت کے ساتھ تحریر ہوا یعنی جو عربی لغت ہے اس کے ساتھ عین اور

فارسی کے ساتھ فا اور ترکی کے ساتھ تا اور یونانی کے ساتھ یا (وعلی ہذا القیاس) تحریر ہوا۔" (لغات سروری:۳)

یہ کتاب متعدّد بار شائع ہوئی۔ راقم کے پیش نظر جولائی ۱۸۹۸ء/صفر ۱۳۱۶ھ مطبع نامی منشی نول کشور، لکھنو کا نسخہ ہے جو کہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ کل صفحات ۷۰۴ ہیں۔

۱۳۔ مدینۃ الاولیاء: یہ کتاب ہمیں دستیاب نہ ہو سکی البتہ مفتی غلام صفدر نے اس کا تعارف میں لکھا ہے "(یہ کتاب) ۱۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے، اردو نظم و نثر اولیاء و مشائخ کے ذکر میں ہے۔ چار سال میں تصنیف ہوئی۔ مطبع منشی نول کشور لاہور میں چھپنے کے لیے دی گئی تھی۔ چھپ چکی ہوگی۔" (دیوان وصال سرور:۲۰)

جب کہ پروفیسر اقبال مجددی لکھتے ہیں "صوفیہ کرام کا عام تذکرہ ہے، اس میں عموماً وہ تراجم شامل ہیں جو خزینۃ الاصفیاء میں ہیں، لکھنؤ سے دو جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

۱۴۔ تحفۃ الابرار (منظوم ترجمہ پندنامہ عطار):

شیخ فریدالدین عطار کے پندنامہ کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ مبتدی طلبہ کے لیے حد درجہ مفید ہے۔ لاہور میں دو بار شائع ہو چکی ہے۔

۱۵۔ احوال الآخرت: مفتی غلام صفدر اور پروفیسر اقبال مجددی نے اس کتاب کا نام "اقوال الآخرت" لکھا ہے جو کہ درست نہیں۔ ہمارے پیش نظر مطبع اسلامیہ (سٹیم پریس) لاہور سے شائع شدہ نسخہ ہے۔ یہ کتاب پنجابی نظم میں آثار قیامت اور یوم حشر کے احوال پر مشتمل ہے۔ اس کے حاشیہ میں شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کی کتاب "قیامت نامہ" کا اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ لیکن یہ اردو ترجمہ مفتی صاحب کا نہیں ہے۔ کل صفحات ۱۶۰ ہیں۔

۱۶۔ مخزن حکمت: یہ کتاب مفتی صاحب کی حیات میں تین مرتبہ شائع ہوئی۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سال (۱۲۸۸ھ) میں ہی اس کے دو ایڈیشن شائع ہو گئے۔ تیسری بار یہ کتاب منشی نول کشور نے کانپور سے ۱۲۹۵ھ میں شائع کی، رائے کنہیا لال مورخ لاہور نے "مکمل مخزن حکمت" سے سنہ اشاعت ۱۲۹۵ھ کا استخراج کیا۔

کتاب کے کل صفحات ۱۷۸ ہیں اور یہ حکماء کے اقوال پر مشتمل ہے، تیسری اشاعت میں فاضل مولف نے اردو و فارسی قطعات و رباعیات کا اضافہ کیا۔ کتاب کے بارے فاضل مولف ابتدائیہ میں لکھتے ہیں:

"احقر المحقر سراپا عیب خالی از ہنر غلام سرور خلف مفتی الشرع الامجد مولانا مفتی غلام محمد ولد حقیقت آگاہ مفتی محمد رحیم اللہ قریشی لاہوری عرض پرداز ہے کہ جب کم ترین پہلی کتابوں خزینۃ الاصفیاء، گلدستۂ کرامت و گنجینۂ سروری المعروف گنج تاریخ کی تحریر سے فراغت مناسب سمجھا کہ ایک اور مختصر کتاب حکماء متقدمین کی تاریخ اور ان کی اقوال افعال و اخلاق و آداب و نکات و حکایات و حکمت و پند و نصایح میں جمع کر کے طلبا کو فائدہ پہنچاؤں، دنیائے فانی میں اپنے نام سے یہ نشان چھوڑ جاؤں جس کے مطالعہ سے ہر ایک شائق فیض پائے، دیکھنے والا حظ اٹھائے، مولف کے حق میں دعائے خیر کرے۔ نام اس کا مخزن حکمت رکھا گیا اور تین حصص میں تقسیم ہوئی۔

پہلا حصہ قدیم زمانہ کے حکیموں کے احوال اور ان کے وعظ و پند و حکمت و نصایح و اقوال و افعال و نکات و حکایات کے ذکر میں۔

دوسرا حصہ اسلام کے ظہور کے بعد کے حکما و فضلا اور ان کے اقوال و افعال و نصایح و نکات و حکایات کے بیان میں۔

تیسرا حصہ بعض بادشاہوں کے حالات و حکایات و اقوال و افعال و اخلاق و عدل و انصاف کی تشریح میں۔" (مخزن حکمت:۳)

۱۷۔ انشائے یادگار اصغری: مفتی صاحب کا ایک بیٹا مفتی غلام اصغر بارہ برس کی عمر میں فوت ہو گیا تھا، یہ کتاب مفتی صاحب نے اپنے اسی بیٹے کے نام سے شائع کروائی۔ اردو نظم و نثر کا مرقع یہ کتاب علمی و ادبی مضامین پر مشتمل ہے۔

۱۸۔ اخلاق سروری: یہ کتاب ہمیں دستیاب نہ ہو سکی البتہ مفتی غلام صفدر اس کے تعارف میں لکھتے ہیں:

علم الاخلاق کے متعلق یہ کتاب نظم و نثر کا حسین امتزاج ہے۔ عوام الناس نے اس کو بہت پسند کیا، محکمہ ہائے تعلیم اور دیسی والیان ریاست نے مصنف سے خرید کر قدر دانی کی۔ یہ کتاب کل دس اجزء پر مشتمل ہے۔ لاہور اور لکھنؤ سے دو دو بار طبع ہو چکی ہے۔

۱۹۔ جامع اللغات: یہ کتاب دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں لغت اردو کا ایک علاحدہ باب ہے، اصطلاحات اردو کی تشریح الگ دی گئی ہے، اسی طرح فارسی عربی لغت و اصطلاحات جدا جدا تحریر کی گئی ہیں اور طب کی اصطلاحات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ مفتی غلام صفدر لکھتے ہیں کہ یہ مفتی غلام سرور لاہوری کی آخری تصنیف (ا) ہے اور اس کے لکھنے میں کئی سال صرف ہوئے، شدید محنت کے سبب مفتی

صاحب کے جسم میں سخت نحافت پیدا کر دی تھی۔ منشی نول کشور نے اس لغت کے لکھنے کے لیے مفتی صاحب کو خاص تحریک دی، اس لغت کو مکمل کرنے کے بعد مفتی صاحب سفر حج پر روانہ ہو گئے جہاں مدینہ شریف سے کچھ مسافت پر ان کا وصال ہو گیا۔

۲۰۔ تاریخ مخزن پنجاب: یہ کتاب مفتی صاحب کی کامل ایک سال کی شبانہ روز محنت کا ثمر ہے۔ تقریباً ۵۸۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب غیر منقسم پنجاب کی مکمل تاریخ ہے۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ سے اکتوبر ۱۸۷۷ء/شوال ۱۲۹۴ھ میں حلیۂ طبع سے آراستہ ہوئی۔

منشی نول کشور اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ان دنوں ایک کتاب لاجواب فن تاریخ میں انتخاب جس کا نام تاریخ مخزن پنجاب ہے، یہ کتاب من کل الوجوہ جامع اور حاوی بیانات احوال شاہان و راجہ گان و رئیسان شہر و علاقہ جات متعلقہ حدود پنجاب ہے۔ اس صفت کی کتاب آج تک نہیں ہوئی، مولف و مدون اس کے بڑے صاحب علم و کمالات ہنرور مفتی غلام سرور صاحب قریشی لاہوری ہیں کہ جن کی تصنیفات سے عمدہ عمدہ کتابیں چھپیں اور پسندیدہ خلائق ہوئیں۔ مصنف علام نے اس کتاب میں بڑی سعی و کوشش سے صحیح صحیح حالات ملک محرومہ پنجاب کے از جزو تا کل بہت مفصل لکھے۔ قابل دید ہے نہ شنید اور اس کتاب کو پانچ حصے اور پچیس قسموں پر منقسم کیا ہے۔

حصہ اول میں دریائے ستلج پار سے جمنا تک جو فی الحال گورنمنٹ پنجاب سے متعلق ہے۔ (اس کی) پانچ قسم ہیں سب حالات شاہان و راجگان و جاگیرداران کے خوب لکھے ہیں۔

دوسرا حصہ میں دریائے ستلج کے داہنے کنارے سے لے کر کل پنجاب کے میدانی پہاڑی ملک کا حال آٹھ قسموں میں لکھا ہے۔

تیسرے حصہ میں پنجاب کوہ شمالی اور اس کے علاقوں کا احوال پانچ قسم میں تسطیر کیا ہے۔

چوتھے حصہ میں پنجاب کے حاکموں اور ناظموں کا ذکر ہے۔ (یہ حصہ مزید) تین قسم پر منقسم ہے۔

پانچویں حصہ میں پنجاب کے کوہستان اور میدان کا احوال متفرق چار قسم میں مسطور ہے۔

فی الحقیقت اس وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ایسی تاریخ کی کتاب کم ہوئی ہوگی۔" (تاریخ مخزن پنجاب: ۵۸۷)

۲۱۔ مفتاح الیقین والایمان علی طریقۃ اہل العرفان:

پروفیسر اقبال مجددی نے مفتی صاحب کی فہرست تالیفات میں (بحوالہ فہرستوارہ دستنوشتہای ایران ۱۰۷۹/۹) اس کتاب کو ذکر کیا ہے، یہ کتاب عربی میں ہے اور اس کا قلمی نسخہ کتاب خانہ ملی، تہران میں موجود ہے۔

۲۲۔ کان تاریخ: مفتی صاحب کی تالیفات میں یہ راقم کی طرف سے اضافہ ہے۔ یہ کتاب ہمیں دستیاب تو نہ ہو سکی البتہ مفتی صاحب کی کتاب تاریخ مخزن پنجاب میں اس کا ذکر بایں الفاظ ملتا ہے:

"احقر غلام سرور خلف مفتی الشرع الامجد مولانا مفتی غلام محمد قریشی لاہوری خدمت میں صاحبان علم و ہنر کے یہ عرض کرتا ہے کہ جب راقم کتاب گلدستہ کرامات و خزینۃ الاصفیاء و گنج تاریخ و کان تاریخ چاروں نسخوں کی تالیف و تصنیف سے فراغت پا چکا... الخ" (تاریخ مخزن پنجاب: ۱)

مذکورہ اقتباس میں مفتی صاحب نے گنج تاریخ کے ساتھ "کان تاریخ" کا ذکر کیا ہے، ہم اسے "گنج تاریخ" کا ہی دوسرا نام قیاس کرتے لیکن اسی اقتباس میں کتب کے نام ذکر کرنے کے بعد "چاروں نسخوں" کے لفظ نے ہمارے اس قیاس کو باطل کر دیا۔ لہذا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "کان تاریخ" ایک الگ تصنیف ہے اگرچہ ہم سے قبل دیگر مورخین نے اس کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی ہمیں اس کی اشاعت بارے معلومات دستیاب ہو سکی ہیں۔

وصال: ۲۷ ذی الحجۃ الحرام ۱۳۰۷ھ بمطابق ۱۴/اگست ۱۸۹۰ء کو مکہ سے مدینہ جاتے ہوئے راستہ میں آپ کا وصال ہو گیا، آپ نے وصال سے قبل وصیت کی تھی کہ ان کی تدفین مدینہ شریف میں کی جائے لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا، مفتی غلام دستگیر قصوری سفر حج میں آپ کے ہمراہ تھے انہوں نے نماز جنازہ کی امامت کی اور میدان بدر میں آپ کی تدفین کی گئی۔

سراج الاخبار میں آپ کے وصال کی خبر بایں الفاظ شائع ہوئی:

افسوس لاہور کے مشہور شاعر و مصنف مفتی غلام سرور صاحب جو حج کو گئے ہوئے تھے -بعد حج کے مدینہ منورہ کو جاتے ہوئے مدینہ منورہ سے تین منزل دور بہ مرض اسہال فوت ہو گئے جن کا جنازہ مولوی غلام دستگیر صاحب قصوری نے پڑھایا۔ اگرچہ مفتی صاحب کی وصیت تھی کہ میری لاش کو مدینہ شریف میں لے جا کر دفن کرنا مگر سڑ جانے کے خوف سے اہل قافلہ نے انکار کیا اور وہیں راستہ میں مقام بدر کے قریب دفن کیے گئے۔ [سراج الاخبار، جہلم، ۶ اکتوبر ۱۸۹۰ء] ••••

فاتحِ عیسائیت حضرت مولانا آلِ حسن موہانی رضوی اور
ردِّ وھابیت

میثم عباس قادری رضوی

صدرالمحققین راس المتکلّمین فاتحِ عیسائیت حضرت علامہ مولانا مولوی سید آلِ حسن رضوی موہانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اکابر علماے اہلِ سنت میں سے ہیں، آپ نے اپنی تصانیف کے ذریعے عیسائیت اور وہابیت کا بہترین رد کیا۔ اہلِ سنت کی طرف سے آپ کے حالات وافکار کا کماحقہ تعارف پیش نہیں کیا جاسکا، جس کی وجہ سے عوام تو دور کی بات ہے علماء کی اکثریت آپ کے نام سے بھی ناواقف ہے۔ اسی وجہ سے اس مقالے میں آپ کے حالاتِ زندگی اور عقائد ونظریات کو پیش کیا جائے گا تاکہ آپ کا تعارف ہوسکے۔

حضرت کے حالاتِ زندگی آپ کے نبیرہ (پوتے) مولانا حیات الحسن موہانی نے ان کی کتاب "تنقیح العبادات" کے شروع میں لکھے ہیں بقدرِ ضرورت ان کا انتخاب پیش ہے، ملاحظہ فرمائیے۔:

"بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ حامداً ومصلیا ومسلما، بعض لوگ ایسے ہیں جن میں یہ خاص ملکہ ہوتا ہے کہ جتنے وہ ہیں اُس سے کہیں بڑھ کر اپنے آپ کو دِکھاتے ہیں اور اپنی تھوڑی سی پونجی کو اس ڈھب اور پہلو سے پیش کرتے ہیں کہ رتی کا تولہ اور تولہ کا سیر ہوجاتا ہے لیکن بعض خدا کے بندے ایسے بھی ہیں کہ جن میں خداداد جوہر اور استعداد موجود ہے مگر کچھ تو تساہل کی وجہ سے اور زیادہ تر انکسار کے باعث نمایاں نہیں ہوتے۔ غرض یہ کہ انھیں دوکان جمانی نہیں آتی اور خود فروشی سے عار آتا ہے اس لیے گاہک کی نظر نہیں پڑتی اور وہ گمنامی اور کسمپرسی کی حالت میں رہ جاتے ہیں بعض لوگ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ اُن کی ہستی اور اُن کا نام وغیرہ جو کچھ ہو وہ بھی بالکل مٹ جائے، انہیں میں مولوی سیّد آلِ حسن قبلہ موہانی تھے کہ اپنی مقبول تصانیف میں نام تک شائع کرنا پسند نہ کیا جب ایسی کوشش ہو تو ایسے شخص کے حالاتِ زندگی کیوں کر باقی رہ سکیں گے اور خصوصاً ایسی حالت میں کہ اُن کے دوست احباب اور اخلاف بھی اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں، چنانچہ راقم الحروف اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان کرتا ہے جس سے ناظرین اندازہ فرمائیں گے کہ یہ لوگ کس قدر مٹنے کے شائق تھے۔ عرصہ ۱۲/ سال کا ہوتا ہے کہ ہمارے قصبہ موہان کے ایک عزیز سید شبیر حسین محسن تاریخ لکھ رہے تھے وہ راقم الحروف کے ذریعہ سے چاہتے تھے کہ مولانا مولوی آلِ حسن کا حلیہ معلوم ہوجائے تاکہ اُس کے انداز سے آپ کی تصویر بنا کر اُس کے فوٹو تاریخ مذکور میں درج کریں اس غرض سے راقم الحروف نے والد مرحوم مولوی سید احمد سعید صاحب سے حلیہ دریافت کیا۔ وجہ پوچھی وجہ معلوم ہونے پر اِس قدر اظہارِ خفگی فرمایا کہ والد مرحوم کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اور فرمایا "دنیا مٹنے کے لیے ہے اس کو مٹنے میں مدد دینی چاہیے"۔ ایسی حالت میں مولانا مولوی سیّد آلِ حسن قبلہ مرحوم کی سوانح زندگی کچھ بھی لکھنا مشکل کیا بالکل مُحال ہے۔ کچھ سرسری طرزِ زندگی حالات اور سلسلۂ معاش بلاقیدِ تاریخ وسنہ جو راقم الحروف کو والد اور چچا صاحب مرحوم وپھوپھی صاحبہ سے معلوم ہوئے ہیں قلمبند کیے دیتا ہے، اُمید ہے کہ مرحوم کی تصانیف کے مطالعہ فرمانے والے حضرات کے لیے باعثِ دلچسپی ہوگا۔

نام وخاندان: آلِ حسن نام خلف مولوی سید غلام سعید خاں، منصب دار سلطنتِ اودھ۔ قصبہ موہان ضلع اناو ملک اودھ کے رہنے والے تھے آپ کے والد بعہد نواب سعادت علی خان بہادر شاہِ اودھ تمامی عدالتوں کے افسرِ اعلیٰ تھے اور مقربینِ خاص شاہِ اودھ موصوف سے تھے جس کی وجہ سے آپ کا قیام خاص لکھنو میں رہتا تھا عالمِ جوانی اور اُسی عہدِ سلطنت میں مولوی سید غلام سعید خاں کا انتقال ہوگیا، خان صرف خطابی تھا۔ مولوی غلام سعید خاں کے والد کا اسمِ گرامی حضرت سید شاہ وجیہ الدین ہے اسی طرح نسب حضرت امام علی موسیٰ رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک اس سلسلہ سے پہنچتا ہے، مولوی سید آلِ حسن بن مولوی سید غلام سعید خاں بن مولوی سید شاہ وجیہ الدین... مولانا مرحوم کی صحیح تاریخِ ولادت معلوم نہیں قیاسی سنہ ولادت ۱۲۰۲ھ بمطابق ۱۸۰۷ء ہے۔ بوقت وفات مولوی غلام سعید خاں کی عمر صرف دس سال کی تھی

اور آپ سے چھوٹے بھائی مولوی اوصاف حسن کی عمر ۴؍ چار سال کی تھی عبداللہ نامی ایک پروردہ کے سپرد گھر اور کُل مال واسباب رہتا تھا، ایک عالی شان مکان موہان میں تعمیر ہو رہا تھا تعمیر بند ہو گئی مال واسباب عبداللہ ودیگر ملازمین لے کر معلوم نہیں کہاں غائب ہو گئے...

علمی ومذہبی خدمات: مولانا کو مناظرہ مذہبی میں خاص ملکہ حاصل تھا لیکن چونکہ آپ کو غصہ بہت جلد آجاتا تھا لہٰذا زبانی مناظرہ سے محترز رہتے تھے مشہور مناظرہ مسیحی و اسلام آگرہ میں جس میں مسلمان کامیاب اور مسیحی ناکام رہے، مسیحیوں کی طرف سے پادری فنڈر اور مسلمانوں کی طرف سے مولانا آلِ حسن مناظرہ کے روحِ رواں تھے، اگرچہ مسلمانوں کی طرف سے مناظرہ زبانی مولانا رحمت اللہ (کیرانوی) مرحوم فرماتے تھے۔ مولانا کی زیادہ تر تصانیف فنِ مناظرہ ہی میں ہیں جن میں کتاب "استفسار" و "استبشار" خاص شہرت رکھتی ہیں۔ یہ کتابیں ہندوستان میں مسیحیوں کے مقابلہ میں اب تک بے مثل ولاجواب ہیں۔

سرکار نظام کی ملازمت: مذہبی خدمات سے باوجود ڈاک اور تار کے انتظام نہ ہونے کے اُسی زمانہ میں مولانا کا شہرہ تمام ہندوستان میں ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک ہو گیا تھا سرکار نظام حیدرآباد میں نواب محمد یار خاں محی الدولہ اول کا۔ بعہد نواب افضل الدولہ بہادر مرحوم نظام خامس خاص اقتدار تھا، نظام الملک خامس مرحوم کے مزاج میں محی الدولہ مرحوم کا سب سے زیادہ رسوخ تھا انتہا یہ ہے کہ سر سالار جنگ اول مرحوم وزیر اعظم تک کو اُن کی مزاج داری کرنی پڑتی تھی محی الدولہ مرحوم ایک مذہبی آدمی تھے، علما وصلحا کے بڑے قدر دان تھے مولانا کی شہرت سن کر کوشش کی کہ مولانا حیدرآباد آجائیں سفر خرچ کے لیے اپنے پاس سے ایک معقول رقم موہان بھیجی اور بہت اشتیاق کے ساتھ حیدرآباد آنے کی ترغیب لکھی۔ شاید بُعدِ مسافت کی وجہ سے مولانا نے باوجود عُسرت (مفلسی) سفر خرچ شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔ نواب صاحب موصوف نے دوبارہ سفر خرچ بھیج کر بہت اصرار سے اشتیاق ظاہر کیا۔ اس زمانے میں مولانا کا دہلی میں وکالت کا شغل تھا اس نوبت پر دوستوں کی رائے سے حیدرآباد کے لیے دہلی سے قصبہ کسمنڈی آئے اور کسمنڈی سے حیدرآباد گئے، حیدرآباد میں مولانا نواب محی الدولہ مرحوم کے مہمان رہے اور بہت جلد بمشاہرہ ماہوار ملازم ہو گئے اِس کو ایک سال کا عرصہ گذرا تھا کہ وطن میں مولانا کے گھر کے لوگوں اور ایک صاحب زادی اور صاحبزادہ مولوی انوار الحسن کا انتقال ہو گیا جن کو نواب صاحب نے سفر خرچ بھیج کر زمرۂ اطبا میں ملازمت کے لیے طلب کیا تھا مولانا پریشان ہو کر حیدرآباد چھوڑ کر وطن میں واپس آگئے چند دنوں موہان میں رہنے کے بعد نواب صاحب موصوف نے تیسری مرتبہ سفر خرچ بھیج کر مولانا کو طلب کیا مولانا ناظم صدارت العالیہ حیدرآباد بمشاہرہ ۶۰۰؍ سما مقرر ہوئے مولانا بہت جلد کسی بہت ہی جلیل القدر عہدہ پر مقرر ہونے والے تھے اور بہت بڑی جاگیر ملنے کو تھی کہ دفعتہً بعارضہ تپ ولرزہ نواب محی الدولہ بہادر کا انتقال ہو گیا مولانا خدمتِ متذکرہ صدر ہی پر آخر تک رہے ایک زمانہ کے بعد بوجہ پیرانہ سالی (بُڑھاپا) ترک ملازمت کر کے موہان ہی میں آکر رہنے لگے اور وہیں بتاریخ ۱۷؍ ربیع الثانی ۱۲۸۷ھ تخمیناً بعمر ۸۵؍ سال بعارضہ فالج انتقال فرمایا۔ اور قصبہ موہان ہی میں خاندانی قبرستان میں بمقام محلہ پکرامد فون ہوئے۔

حلیہ: پیشانی کشادہ، گورا رنگ بہت کُھلا ہوا، بہت بڑی بڑی نہایت خوبصورت آنکھیں، بھنویں گہنی ہوئی لیکن بیچ میں فاصلہ تھا، بینی بلند ودراز کسی قدر آگے کو جھکی ہوئی، داڑھی بڑی اور گھنی نیچی، قد متوسط، ہاتھ پیر چھوٹے چھوٹے گداز بہت ہی خوبصورت ونرم، آنکھوں کا خاص وصف تھا کہ عاشقِ رسول وآلِ رسول تھیں رسولِ خدا ﷺ یا اہلِ بیت کے نام لینے پر فوراً اشکبار ہوتیں، دل ہمیشہ اسی محبت میں سوزاں وگداز رہا۔ مولانا وفورِ محبتِ اہلِ بیت میں آخر آخر بالکل ہی اہلِ بیت کے لیے رہ گئے تھے کسی بزرگ کا اہلِ بیت سے نام لیتے یا سنتے ہی مولانا کی بڑی بڑی خوبصورت نرگس شہلا آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری ہو جاتا تھا باوجود انتہائے زہد وتقویٰ عشرۂ محرم میں اختیار سے کسی قدر باہر ہو جاتے، تعزیہ رکھنے کو بدعت وگناہ سمجھتے تھے۔ مولانا کی تصانیف میں ایک کتاب کا ذکر ولادت حضرت پیغمبر ﷺ میں ہے کتابِ مذکور اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

امروز شاہِ شاہاں مہماں شدہ است مارا
جبریل باملائک دربان شدہ است مارا

اکثر مجالسِ میلاد میں مولانا اپنی کتاب پڑھا کرتے تھے آخر آخر میں یہ حال ہو گیا تھا کہ اپنے گھر میں سال میں ایک مرتبہ ضرور مجلسِ میلادِ نبوی منعقد کرتے اور خود ہی منبر پر پڑھنے کو بیٹھتے بیتِ متذکرہ کے پہلے ہی مصرعہ پر ہچکیاں لگ جاتیں اور گھنٹوں رہتیں کہ مولانا پڑھنے سے مجبور ہو جاتے اور کسی دوسرے شخص کو پڑھنا پڑتا تھا، مولانا کو بیعت

ارادت مولانا انوار الحق قدس اللہ سرہ لکھنوی فرنگی محلی سے تھی جن کو آپ "میاں" کے لفظ سے یاد کیا کرتے تھے۔

تصنیفات: مولانا کے قلم کی جس قدر تحریریں مجھے ملی ہیں اُن کی تقسیم کر کے حسبِ ذیل تصانیف میں نے جمع کی ہیں (۱) کتاب مرغوب در ماخذ جوابات نصاریٰ (۲) رسالہ اردو وحدت وجود (۳) تقریر دربحث لا تناہی (۴) مولد نامہ مصطفوی (۵) دامغہ علویہ (۶) انتخاب ترجمہ ارشاداتِ عیسویہ (۷) تنقیح العبادات (۸) مجمع النورین در بیان الوہیت ورسالت (۹) رسالہ نجاتِ اُخروی (۱۰) استفسار (۱۱) استبشار (۱۲) تذکرہ شہادت سید الشہدا (۱۳) تذکرۃ المولیٰ (۱۴) فوائد مثنوی مولانا روم (۱۵) تقاریر در بحث لا تناہی (۱۶) ترجمہ بعض آیاتِ قرآنی در باب اعتقادات (۱۷) ابحاثِ مختلفہ۔

اولاد: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی اولاد کا اختصار کے ساتھ لکھ دوں کہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ (۱) اولاد حسن مرحوم (۲) عارف حسن مرحوم (۳) انوار الحسن مرحوم (۴) لطف حسن مرحوم (۵) شریف الحسن مرحوم (۶) احمد سعید مرحوم (۷) دختر کلاں مرحومہ عقد بہ حافظ نیاز حسن مرحوم (۸) دختر دوم مرحومہ عقد بہ مولوی محبوب الحسن مرحوم لاولد (۹) دختر سوم عقد بہ حافظ محمد ابراہیم صاحب۔

فقط تحریر ۱۷ ذوالحجہ ۱۳۲۹ھ

سید محمد حیات الحسن موہانی۔ اورنگ آباد، دکن

ملخصاً (تنقیح العبادات صفحہ ۱ تا ۸ مطبوعہ اردو پریس، علی گڑھ)

مولانا آلِ حسن موہانی کے متعلق ڈاکٹر خالد محمود دیوبندی کی تلبیس کا جائزہ:

حضرت علامہ مولانا آلِ حسن مُہانی رضوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب "تنقیح العبادات" میں اہلِ سنت کی تائید اور وہابیہ کی خوب تردید کی ہے، دیوبندیوں کے نام نہاد "محقق" ڈاکٹر خالد محمود دیوبندی نے مولانا آلِ حسن موہانی رضوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب "الاستفسار" کے مقدمہ میں آپ کی کتب میں درج عقائد کو "مسلمانوں کے اجماعی عقائد" قرار دیا ہے:

"ان کتابوں پر نظر کرنے سے مولانا آلِ حسن کے عقائد کا ان الفاظ میں پتہ ملتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہ اہلِ سنت کے اجماعی عقائد تھے۔" (مقدمہ کتاب الاستفسار ص: ۵۵ مطبوعہ دار المعارف، الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور)

اسی مقدمے میں ڈاکٹر خالد محمود دیوبندی نے ایک اور مقام پر مولانا آلِ حسن موہانی کے افکار و خیالات کو "بحیثیت مجمع النورین اسلامی نظریہ فکر کے گرد حفاظت کے عظیم پہرے" قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"آپ کے افکار و خیالات بحیثیت مجمع النورین اسلامی نظریہ فکر کے گرد حفاظت کے عظیم پہرے ہیں آپ کے پوتے سید محمد حیات الحسن موہانی نے آپ کی کتاب "تنقیح العبادات" کے ابتدائیہ میں آپ کی کچھ اور کتابوں کا ذکر بھی کیا ہے جن میں تذکرۂ شہادت (سانحہ کربلا) اور فوائد مثنوی مولانا روم زیادہ اہمیت رکھتی ہیں" (مقدمہ کتاب الاستفسار صفحہ ۶۴ مطبوعہ دار المعارف، الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور)

حضرت مولانا آلِ حسن موہانی کے عقائد و نظریات:

ذیل میں حضرت مولانا آلِ حسن موہانی کی کتب کے وہ اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں جن میں آپ نے امام الوہابیہ مولوی اسماعیل دہلوی اور ان کے پیر سید احمد (کے بنائے ہوئے وہابی دیوبندی فرقہ) کے اصول و نظریات کا بہترین رد کیا ہے۔

مولوی اسماعیل دہلوی اور اس کے پیر سید احمد پہلے بزرگوں کو مشرک اور بدعتی کہتے تھے حالانکہ خود بدعتی تھے:

"مولوی اسماعیل صاحب اور سید احمد صاحب اگرچہ اگلے بزرگوں کی باتوں کو شرک اور بدعت ضالہ بتایا کرتے تھے مگر آپ اُنہوں نے بہت سی باتیں نکالیں کہ خیر القرون میں اس کا نشان اور پتہ بھی نہیں ملتا"۔ (تنقیح العبادات صفحہ ۴۵ مطبوعہ اردو پریس، علی گڑھ)

وہابیہ مولوی اسماعیل دہلوی کو امام رازی سے بڑا سمجھتے ہیں:

اسی کتاب میں ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ "مولوی اسماعیل صاحب نے جن کو وہابیہ ہند امام فخر الدین رازی سے افضل اور برابر امام ابو حنیفہ اور شافعی کے جانتے ہیں"۔

(تنقیح العبادات صفحہ ۶۰ مطبوعہ اردو پریس، علی گڑھ)

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نور ہیں اور آپ کا سایہ نہ تھا:

حضرت مولانا آلِ حسن موہانی رضوی "مولدِ مصطفوی" میں حضور علیہ الصلاۃ والسلام کا نور ہونا اور آپ کا سایہ نہ ہونا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

آدمی ہوتا تو اس ماہ کا سایہ ہوتا
جس کے سایہ نہ ہو وہ نورِ خدا ہے بخدا

(مولدِ مصطفوی صفحہ ۲۴ مطبوعہ اردو پریس واقع علی گڑھ)

یہ عقیدہ بھی وہابیہ دیوبندیہ کے عقیدے کے خلاف ہے، کیونکہ وہابیہ دیوبندیہ حضور ﷺ کی نورانیتِ حسّی کے عقیدہ کی بِناء پر اہلِ سنت وجماعت کو بشریت کا منکر قرار دیتے ہیں، دیوبندیہ کے مولوی سرفراز گکھڑوی دیوبندی نے اپنی کتاب "تنقید متین" میں حضور ﷺ کے سایہ مبارک نہ ہونے کے عقیدے کے متعلق یہاں تک لکھا ہے:

"اصل میں آپ ﷺ کا سایہ نہ ہونے کا مسئلہ شیعہ کا ہے"

(تنقید متین صفحہ ۱۲۲،۱۲۱ ناشر انجمن اسلامیہ گکھڑ ضلع ،گوجرانوالہ طبع اوّل ۱۹۷۶ء)

یعنی گکھڑوی صاحب کے مطابق مولانا آلِ حسن موہانی بشریت کے منکر اور شیعہ عقیدہ رکھنے والے ہوئے۔ نعوذ باللّٰہ

مسئلہ استمداد میں وہابیہ دیوبندیہ کے استدلال کا ردِ بلیغ:

"وہابیہ لوگ کاملوں کی ارواح سے فیض حاصل کرنے کو محال اور اس اعتقاد اور اُس کے اعمال کو شرکِ جلی ٹھہراتے ہیں سو اُن کے اس قول کا غلط ہونا ثابت کیا جاتا ہے از روئے چند مقدموں کے"۔

(تنقیح العبادات صفحہ ۵۰ مطبوعہ اردو پریس، علی گڑھ)

"جاننا چاہیے کہ اس قولِ اخیر کا رواج دینے والا فرقہ وہابیہ کا ہے جو تیرہ صدی میں پیدا ہوا ہے سو اُنہوں نے اور بھی بہت سی باتیں غلط نکالی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سب دین کی باتیں ہیں ازاں جملہ یہ کہ قرآن شریف میں جو فرمایا ہے کہ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ یعنی "مشرکین پکارتے ہیں غیر اللہ کو" یا فرمایا ہے: لَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا تو مطلق ماسوی اللہ کو فرمایا ہے یا رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا: اذا سئلت فاسئل اللّٰہ و اذا استعنت فاستعن باللّٰہ تو یہاں بالکل ماسوی اللہ سے مانگنے کو منع فرمایا اور فرقہ وہابیہ ایسی آیتوں اور حدیثوں کو ایسے محل میں لاتے ہیں بلکہ صاف تقریریں لکھتے اور وعظ میں بیان کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں مطلق سے ماسوی اللہ مُراد نہیں بلکہ وہی اشخاص مراد ہیں جو نظر نہیں آتے جیسے ارواح اور فرشتے۔ حالانکہ یہ تخصیص قطعًا باطل ہے اور تحریفِ معنوی قرآن اور حدیث کی لازم آتی ہے اسی کا نام بدعتِ ضالہ ہے جو جہنم کو کھینچ لے جانے والی ہے"۔ (تنقیح العبادات صفحہ ۲۲، ۲۳ مطبوعہ اردو پریس، علی گڑھ)

وہابیہ بزرگوں کی قبروں کا ادب کرنے کو بت پرستی کہتے ہیں: "پاس آدابِ قبورِ صالحین (یعنی بزرگوں کی قبور کا ادب کرنے) کو وہابیہ بُت پرستی بتاتے ہیں حالانکہ ہمارے اگلے علمائے حقانی لکھتے آئے ہیں کہ مقبور کے ساتھ مانند اُس پاس اور لحاظ کے پیش آنا چاہیے جیسے اُس کی حیات میں پیش آنا ہوتا"۔ (تنقیح العبادات صفحہ ۳۶ مطبوعہ اردو پریس، علی گڑھ)

بزرگانِ دین کی قبر کے قریب مسجد بنانے کا ثبوت اور وہابیہ کا رد: "جو وہابیہ طعنہ دیا کرتے ہیں کہ اکثر مشائخ ہند میں ہوتا رہا ہے کہ مسجد کے پاس مقبرہ یا مقبرہ کے پاس مسجد بنائی جاتی ہے اس کو وہابیہ کہتے ہیں کہ عین قبرستان میں نماز پڑھنا ہے اور یہ نہیں دیکھتے کہ جہاں سے اسلام نکلا ہے وہاں سے یہی چلا آیا ہے کہ مسجدِ نبوی اور مرقدِ مصطفوی سے علی صاحبہا الصلاۃ والسلام اور اُس کے ساتھ حضرت صدیق اور فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قبر ایک ہی جگہ بنی ہے، ازاں جملہ تعظیم تبرکات کی کہ اُس کو بھی وہابیہ شرک فی العبادت اور بت پرستی کہتے ہیں حالانکہ قرآن شریف سے ظاہر ہے کہ وہ صندوق جس میں تبرکات حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے رکھے رہتے تھے ایسا متبرک اور واجب التعظیم تھا کہ فرشتے اُسے اُٹھایا کرتے تھے پس حضرت خاتم النبیین علیہ الصلاۃ والسلام کے تبرکات بطریقِ اولیٰ واجب التعظیم ٹھہرے"۔ (تنقیح العبادات صفحہ ۴۰، ۳۹ مطبوعہ اردو پریس، علی گڑھ)

وہابیہ شاہ ولی اللہ کو اپنا پیشوا تو کہتے ہیں لیکن دراصل اُن کے مخالف ہیں:

"جن علمائے ہند کو وہابیہ اپنا مقتدا جانتے ہیں یعنی خاندان شاہ ولی اللہ صاحب کا سو اُن کے والد کے وقت سے اُن کے بعض پوتوں تک مجلس رسول اللہ ﷺ کی اور اور اپنے پیروں کا عرس باستثناء گانے کے کیا کرتے تھے اور اُس کو بہتر جانا کرتے تھے یعنی تعینِ تاریخ کرتے تھے"۔ (تنقیح العبادات صفحہ ۴۵ مطبوعہ اردو پریس، علی گڑھ)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی عرس منعقد کرنے کو اچھا جانتے تھے: "اور شیخ عبدالحق دہلوی نے کہ اُن کو بھی وہابیہ مغربی مانتے ہیں تعینِ عرس کا استحسان اپنے پیر سے نقل کر کے اُس کو بدعت ہونے سے خارج ٹھہرایا ہے"۔

(تنقیح العبادات صفحہ ۴۶ مطبوعہ اردو پریس، علی گڑھ)

ڈاکٹر خالد محمود دیوبندی کے اعلیٰ حضرت سے بُغض کا روشن ثبوت: جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر خالد محمود دیوبندی نے حضرت مولانا آلِ حسن موہانی رضوی کی کتاب "الاستفسار" اپنے مقدمہ اور اہتمام سے شائع کروائی، اس کتاب میں حضرت مولانا آلِ حسن موہانی رضوی "نبی" کا ترجمہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"نبی کے معنی ہیں غیب کی خبر دینے والا"۔(کتاب الاستفسار صفحہ ۲۸۸ مطبوعہ دارالمعارف، الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور)

نبی کے اس ترجمہ کی وجہ سے ڈاکٹر خالد محمود دیوبندی کو حضرت مولانا آلِ حسن موہانی پر اعتراض کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ "نبی" کا یہی ترجمہ سیدی اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنت مجدد دین وملت علامہ مولانا مفتی الشاہ احمد رضا خان قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی کیا ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرت کی طرف سے کیا گیا نبی کا یہ ترجمہ ڈاکٹر خالد محمود دیوبندی صاحب سے ہضم نہ ہو سکا اور ڈاکٹر صاحب نے (دیوبندی مذہب کا دوہرا معیار برقرار رکھتے ہوئے) اس ترجمہ کو "مقامِ نبوت سے انحراف" قرار دیتے ہوئے لکھ دیا:

"مولانا احمد رضا خان نے قرآن کریم کے ترجمہ میں نبی کے معنی غیب کی خبریں دینے والے کیے ہیں۔" (مطالعۂ بریلویت جلد ۲ صفحہ ۱۵۸ مطبوعہ دارالمعارف اردو بازار لاہور، ایضاً جلد ۲ صفحہ ۱۵۷ مطبوعہ حافظی بک ڈپو، دیوبند)

اس کے کچھ سطر بعد یہی معاند ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا احمد رضا خان نے لفظ نبی کا عام ترجمہ کر کے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقامِ نبوت سے کھلے بندوں انحراف کیا ہے۔"

(مطالعۂ بریلویت جلد ۲ صفحہ ۱۵۸ مطبوعہ دارالمعارف اردو بازار لاہور، ایضاً جلد ۲ صفحہ ۱۵۷ مطبوعہ حافظی بک ڈپو، دیوبند)

ان اقتباسات سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ "نبی" کے معنی "غیب بتانے والے" کرنے سے ڈاکٹر خالد دیوبندی صاحب کو کس قدر تکلیف ہے، لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مولانا آلِ حسن موہانی کی جو کتاب "الاستفسار" اپنے مقدمے اور حواشی کے ساتھ شائع کروائی ہے، اس میں بھی "نبی" کا یہی معنی لکھا ہے، اس کے مقدمہ یا حاشیہ میں انہوں نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ "مولانا آلِ حسن موہانی نے "نبی" کا ترجمہ "غیب کی خبر دینے والا" کر کے مقامِ نبوت سے کُھلے بندوں انحراف کیا ہے" جب دونوں کا ترجمہ ایک جیسا ہے تو صرف اعلیٰ حضرت پر ہی اعتراض کیوں؟، دیوبندی دھرم کے یہی دوہرے معیار ہیں جن کی وجہ سے یہ ہر جگہ خفت اُٹھاتے ہیں۔ (راقم کے پاس دیوبندی علما کے ایسے حوالہ جات محفوظ ہیں جن میں انہوں نے بھی "نبی" کا ترجمہ "غیب کی خبریں دینے والا" کیا ہے)۔ قارئین! آپ نے ملاحظہ کیا کہ مولانا آلِ حسن موہانی کی کتب سے پیش کیے گئے یہ وہابیت شکن اقتباسات عقائدِ وہابیہ دیوبندیہ کے سخت خلاف ہیں، مولانا آلِ حسن موہانی کے ان وہابیت شکن نظریات کا علم ہونے کے باوجود ڈاکٹر خالد محمود دیوبندی نے مولانا آلِ حسن موہانی کے عقائد کی تعریف کی اور ان کے عقائد کو اہلِ سنت کے اجماعی عقائد تسلیم کیا جو کہ دراصل ان کی اپنی تردید ہے۔ قارئین حیران ہوں گے کہ پھر ڈاکٹر صاحب نے اپنی تردید کرتے ہوئے ایسا کیوں لکھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ تقیہ دیوبندی مذہب کا اہم طریقۂ واردات ہے جس سے کام لیتے ہوئے ڈاکٹر خالد محمود دیوبندی صاحب نے مولانا آلِ حسن موہانی کے عقائد کو "مسلمانوں کے اجماعی عقائد" اور "بحیثیت مجمع النورین اسلامی نظریہ فکر کے گرد حفاظت کے عظیم پہرے" تسلیم کیا ہے۔ جو شخص دیوبندیت سے اچھی طرح واقف ہے اسے دیوبندیوں کے اس طریقہ واردات کا بخوبی علم ہے اس لیے ڈاکٹر صاحب سے اس فعل کا صادر ہونا عجیب بات نہیں۔ یہ دیوبندی جہاں خود پھنس جائیں یا ان کو سادہ لوح سنی عوام کو اپنے جال میں پھنسانا منظور ہو وہاں یہ اپنے عقائد کو چھپا کر تقیہ کر لیتے ہیں، ان کے پیشوا مولوی اشرف علی تھانوی صاحب "کان پور" گئے، تو انہوں نے وہاں اہلِ سنت کے ساتھ مجالسِ میلاد وقیام میں شرکت شروع کر دی، اس بات کی اطلاع جب مولوی رشید احمد گنگوہی دیوبندی صاحب کو ملی تو انہوں نے تھانوی صاحب سے وضاحت طلب کی، تھانوی صاحب نے اس کا جواب دیا:

"وہاں بدون شرکت قیام کرنا قریب بحال دیکھا اور منظور تھا وہاں رہنا کیونکہ دنیوی منفعت بھی ہے کہ مدرسہ سے تنخواہ ملتی ہے" (تذکرۃ الرشید جلد اوّل صفحہ ۱۱۹ مطبوعہ ادارہ اسلامیات، ۱۹۰ انارکلی، لاہور۔ سیف یمانی صفحہ ۳۰ مطبوعہ مدنی کتب خانہ، نور مارکیٹ، اردو بازار، گوجرانوالہ)

دیوبندیوں کی تقیہ بازی کی تفصیل کے لیے امام المناظرین شیر بیشہ اہلِ سنت ابوالفتح حضرت علامہ مولانا مفتی حافظ قاری محمد حشمت علی خاں لکھنوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتب "راد المہند"، "الصولۃ الاحدیہ علی تقیۃ حزب التھانویہ" اور شہزادۂ اعلیٰ حضرت مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مصطفی رضا خان نوری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب "وہابیہ کی تقیہ بازی" ملاحظہ فرمائیں، دیوبندیوں کی منافقت اور تقیہ بازی کے بیان پر مشتمل راقم کا ایک مقالہ بھی زیرِ ترتیب ہے۔ ڈاکٹر خالد محمود دیوبندی کی اس کاروائی کا مقصد ردِ عیسائیت میں عظیم خدمات سرانجام دینے والے عالمِ اہلِ سنت حضرت مولانا آلِ حسن موہانی کو اپنے کھاتے (فرقے) میں ظاہر کرنا ہے۔ جس میں وہ یقیناً کامیاب نہیں ہو سکے۔ ■■■

میانمار میں اسلام اور مسلمان

☆==========پروفیسر شارق جمال اعظمی

بدھ مت ایک مذہب اور ایک فلسفہ کا نام ہے جو گوتم بدھ کی تعلیمات سے منسوب ہے۔ ان تعلیمات کا سلسلہ چوتھی سے پانچویں صدی قبل مسیح کے شمال مشرقی برصغیر سے ملتا ہے۔ دنیا میں جب دکھوں کی بہتات تھی اور زندگی زخموں سے چور تھی تو بدھ انسان کے لیے زندگی کا ایک ایسا فارمولہ لے کر آئے جو ترکِ خواہشات کے ذریعے زندگی کی لامتناہی تکلیفوں اور زخموں کا مداوا کرتا تھا۔ بدھ نے خود کو ایک لمبی تپسیا کی بھٹی میں جلا کر روح اور بدن کو دنیاوی آلائشوں سے پاک کرنا اور خواہشات کو حقیر جان کر زیر کرنا سیکھا، اور پھر یہ سبق دنیا کو سکھایا تاکہ انسان دکھ اور تکلیف سے نجات پاسکے۔ بدھ کی تعلیمات میں نہ صرف شہرت، طاقت اور دولت کی نفی کی گئی بلکہ بے حسی کو بھی انسان کے دکھ کا باعث گردانا گیا۔ ان کے خیال میں اس بے حسی کا علاج آگاہی سے ہی ممکن ہے۔ ان کا اپنے ماننے والوں کے لیے ایک ہی پیغام تھا. صبر، شکر، امن اور شانتی۔ ان کی فکر یہ تھی کہ "جس نے کسی جانور کو بھی قتل کیا تو وہ ایسے ہی ہے جیسے اس نے کسی انسان کو قتل کیا" دنیا بھر میں اس مذہب کے پیروکاروں کی تعداد تقریباً ۳۵ کروڑ ہے اور ان کی اکثریت والا ایک اہم ملک ہے "میانمار" جسے "برما" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ میانمار کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق وہاں کی کل پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی میں ۸۹ فیصد بودھ ہیں۔ مسلمان یہاں کل آبادی کا ۴ فیصد حصہ ہیں ۔ سات صوبوں کے اس ملک میں مسلمانوں کی اکثریت راکھین (رخائن) میں آباد ہے جہاں تقریباً چھ لاکھ مسلمان موجود ہیں۔

مسلمانوں کی یہاں آمد کے آثار اسلام کے ابتدائی سالوں میں ہی تقریباً ۱۰۵۰ء سے ملتے ہیں جب مسلمان یہاں تجارت کی غرض سے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہاں مسلم آباد کاری کا سلسلہ گیارھویں صدی عیسوی میں شروع ہوا اور مغلیہ حکمرانوں کے عروج کے زمانے تک جاری رہا۔ بعدازاں جب برطانوی سامراج نے یہاں اپنے پنجے گاڑے تو حکومت کی طرف سے بنگالی مسلمانوں کی برما کے علاقوں کی طرف ہجرت کی حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ وہ ان زرخیز علاقوں میں کھیتی باڑی سے منسلک کیے جاسکیں۔ ان کی زیادہ تر آبادکاری "اراکان" میں ہوئی۔ اس وقت بنگال اور برما کے اس سرحدی علاقے کی کوئی عالمی سرحد نہ تھی، اور ہجرت پر پابندی بھی نہ تھی۔ چٹاگانگ سے ہزاروں بنگالی اس علاقے میں رہائش اختیار کرنے لگے۔ ۱۹۴۸ء میں برما کی آزادی کے وقت بھی بہت سے مسلمان یہاں ہجرت کر کے آئے۔ ۱۹۷۱ء میں جب بنگال جنگ کی حالت میں تھا، اس وقت بھی یہ ہجرت جاری رہی۔

میانمار مسلم آبادی پیچیدگیوں کا آغاز برما کے بادشاہ Bayintnaungo نے ۱۵۵۰-۱۵۸۹ میں کیا۔ اس دور میں مسلمانوں کے مذہبی تہوار عیدالاضحیٰ اور گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگوادی گئی۔ ۱۷ویں صدی میں بادشاہ بودھاپایہ نے چار نہایت اہم مسلم اماموں کو گرفتار کر کے قتل کروادیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۷۸۲ء میں بادشاہ نے علمائے کرام کو خنزیر کا گوشت کھانے پر مجبور کیا اور نہ کھانے پر ان کے لیے موت کی سزا تجویز کی، اور جب انہوں نے انکار کیا تو انہیں مار دیا گیا، اس طرح مقامی آبادی اور مسلمانوں کے درمیان فسادات کا آغاز ہوا۔

اراکان وہ سرزمین ہے جہاں خلیفہ ہارون رشید کے عہدِ خلافت میں مسلم تاجروں کے ذریعہ اسلام پہنچا، اس ملک میں مسلمان بغرض تجارت آئے تھے اور اسلام کی تبلیغ شروع کردی تھی، اسلام کی فطری تعلیمات سے متاثر ہو کر وہاں کی کثیر آبادی نے اسلام قبول کر لیا اور ایسی قوت کے مالک بن بیٹھے کہ 1430ء میں سلیمان شاہ کے ہاتھوں اسلامی حکومت کی تشکیل کر لی، اس ملک پر ساڑھے تین سو سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی، مسجدیں بنائی گئیں، قرآنی حلقے قائم کئے گئے، مدارس وجامعات کھولے گئے، ان کی کرنسی پر 'لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ' کندہ ہوتا تھا اور اس کے نیچے ابوبکر عمر عثمان اور علی کے اسما درج ہوتے تھے۔ اس ملک کے پڑوس میں برما تھا جہاں بدھسٹوں کی حکومت تھی، مسلم حکمرانی بودھسٹوں کو ایک آنکھ نہ بھائی اور انہوں نے 1784ء میں اراکان پر حملہ کر دیا، بالآخر اراکان کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اسے برما میں ضم کر لیا اور اس کا نام بدل کر میانمار رکھ دیا۔

1824ء میں برما برطانیہ کی غلامی میں چلا گیا، پھر سو سال بعد 1938ء میں انگریزی حکومت سے آزادی حاصل کرتے ہی میانمار کی

بدھسٹ آبادی نے "مسلم مٹاؤ پالیسی" کے تحت اسلامی شناخت کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی، دعاۃ پر حملے کیے، مسلمانوں کو نقل مکانی پر مجبور کیا، چنانچہ پانچ لاکھ مسلمان برما چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ کتنے لوگ پڑوسی ملک بنگلادیش ہجرت کر گئے، مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر شاہ فہد نے ان کے لیے ہجرت کا دروازہ کھول دیا، اس طرح ان کی اچھی خاصی تعداد نے مکہ میں بودوباش اختیار کرلی، آج مکہ کے باشندگان میں 25 فیصد اراکان کے مسلمان ہیں۔ اس طرح مختلف اوقات میں مسلمانوں کو نقل مکانی پر مجبور کیا گیا، جو لوگ ہجرت نہ کرسکے ان کی ناکہ بندی شروع کردی گئی، دعوت پر پابندی ڈال دی گئی، مسلمانوں کے اوقاف چراگاہوں میں بدل دیے گئے، برما کی فوج نے بڑی ڈھٹائی سے ان کی مسجدوں کی بے حرمتی کی، مساجد و مدارس کی تعمیر پر قدغن لگا دیا، لاؤڈ سپیکر سے اذان ممنوع قرار دی گئی، مسلم بچے سرکاری تعلیم سے محروم کیے گیے، ان پر ملازمت کے دروازے بند کردیے گئے، 1982ء اراکان کے مسلمانوں کو حق شہریت سے بھی محروم کردیا گیا، اس طرح ان کی نسبت کسی ملک سے نہ رہی۔ ان کی لڑکیوں کی شادی کے لیے ۲۵ رسال اور لڑکوں کی شادی کے لیے ۳۰ رسال عمر کی تحدید کی گئی، شادی کی کاروائی کے لیے بھی سرحدی سیکوریٹی فورسیز سے اجازت نامہ کا حصول ناگزیر قرار دیا گیا، خانگی زندگی سے متعلقہ سخت سے سخت قانون بنائے گئے۔

ساٹھ سالوں سے اراکان کے مسلمان ظلم وستم کی چکی میں پس رہے ہیں، ان کے بچے ننگے بدن، ننگے پیر، بوسیدہ کپڑے زیب تن کیے قابل رحم حالت میں دکھائی دیتے ہیں، ان کی عورتیں مردوں کے ہمراہ کھیتوں میں زراعت کا کام کرکے گذر بسر کرتی ہیں۔ لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ ایسے سنگین اور روح فرسا حالات میں بھی مسلمان اپنے دینی شعائر سے جڑے ہیں اور کسی ایک کے متعلق بھی یہ رپورٹ نہ ملی کہ دنیا کی لالچ میں اپنے ایمان کا سودا کیا ہو۔

1921ء میں یہاں مسلمانوں کی کل آبادی تقریبًا پانچ لاکھ تھی۔ برمی مسلمان ان مسلمانوں کو کہا جاتا تھا جو مغلیہ دور سے یہاں آباد تھے، بعد میں آباد ہونے والے مسلمانوں کو "روہنگیا" کا نام دیا جانے لگا۔ برمی مسلمانوں، انڈین مسلمانوں اور انڈین ہندوؤں کو یہاں برٹش دور میں "کالا" کا نام دیا گیا۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان نے برما پر چڑھائی کی تو اس دوران برٹش فورسز نے مقامی مسلمانوں کو جاپانیوں کے مقابلے کے لیے مسلح کیا۔ اس طرح مقامی نیشنلسٹ جو برطانوی سامراج کے خلاف تھے، وہ بھی ان مسلح مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور دوسری طرف جاپانی فوجیوں نے بھی مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کیا۔ تاریخ دانوں کے مطابق تقریبًا پانچ ہزار مسلمان اس لڑائی میں مارے گئے اور تقریبًا 22 ہزار کے قریب مسلمان جاپانیوں سے اپنی جان بچاتے ہوئے بنگال ہجرت کر گئے۔

1930ء میں "برمی مسلم فسادات" نے شدت اس وقت اختیار کی تھی جب رنگون پورٹ پر لیبر ایشو ابھرا، اور انڈین مسلم ورکرز ہڑتال پر چلے گئے۔ برٹش حکومت نے انہیں دھمکانے کے لیے مقامی برمیوں کو ان کی جگہ بھرتی کرلیا، لیکن اپنی ملازمتیں جاتے دیکھ کر مسلمان پھر سے اپنے کام پر واپس آگئے۔ اس طرح برمی بھرتیاں ملتوی ہوگئیں۔ برمی مزدوروں نے سارا الزام انڈین مسلمانوں کے سر دھر کر تقریبًا 200 کے قریب مسلمانوں کو قتل کردیا۔

1938ء میں برمیوں نے "برما صرف برمیوں کے لیے" تحریک کا آغاز کیا اور مسلمانوں کا قتل عام شروع کردیا۔ ان فسادات میں 113 مساجد کو شہید کردیا گیا، اور مسلمانوں کی املاک بھی لوٹ لی گئیں۔ جنرل نیون جب اقتدار میں آیا تو اس نے مسلم دشمن رویے کو عروج پر پہنچا دیا۔ برمیز نیشنیلٹی لا پاس کروایا گیا جس کے تحت روہنگیا مسلمانوں کو شہریت کے حق سے محروم کردیا گیا۔ جو مسلمان فوج میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے انہیں ان کی ملازمتوں سے برخاست کردیا گیا۔ مسلم کمیونٹی کے لیے دیگر معاشی و معاشرتی مسائل پیدا کیے گئے۔

1971ء سے 1978ء کے دوران متعدّد بار مسلم آبادی والے صوبے کے راہبوں نے بھوک ہڑتال کرکے یہ مطالبہ کیا کہ ان مسلمانوں کو بنگلہ دیش دھکیل دیا جائے۔ یہ وہ ریاست ہے جہاں مسلمان 350 سالوں سے آباد تھے، اور ان کے پاس ایسے وسائل بھی نہ تھے کہ وہ ان علاقوں سے بآسانی کوچ کرسکتے۔ دوسری طرف بنگلہ دیش بھی انہیں قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ برما کے بدھ بھکشوان مسلمانوں کو اپنے ملک پر ایک بوجھ اور ایک ناسور تصور کرتے اور انہیں کسی صورت قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اسی لیے وقتًا فوقتًا ان کی نسل کشی کے مواقع پیدا کرتے رہے۔

افغانستان میں طالبان کی حکومت آئی تو بامیان میں بدھا کا مجسمہ توڑ دیا گیا جس کے ردعمل کے طور پر برما کے بدھ راہبوں نے مسلمانوں کے خلاف انتہائی متشددانہ رویہ اپنایا۔ ان کا برمی حکومت سے مطالبہ تھا کہ برما کے صوبے Taungoo کی سب سے قدیم مسجد ہانتھا Hantha کو مسمار کیا جائے۔ اس مطالبے کو منوانے کے لیے مسلمانون کا قتل عام کیا گیا اور ان کی املاک کو نذر آتش کرکے حکومت پر دباؤ ڈالا گیا۔ بالآخر اس مسجد پر بلڈوزر پھیر دیا گیا۔

1997ء میں منڈالے میں ایک قدیم بدھا بت کے کچھ حصے مسمار کرنے اور ایک بدھ لڑکی کی آبروریزی کا الزام مسلمانوں کے سر لگا دیا گیا، حالاں کہ یہ الزام بعد میں جھوٹا ثابت ہوا لیکن محض اس الزام پر تقریباً 1500 مسلمان بدھ بھکشوؤں کے ہاتھوں قتل ہوئے، قرآن پاک کی بے حرمتی کی گئی، مسلمانوں کی دکانوں اور گھروں کو نذر آتش کیا گیا۔

2001ء میں عام آبادی کو مسلمانوں کے خلاف اکسانے کے لیے شر انگیز پمفلٹ تقسیم کیے گئے۔ جس کے نتیجے کے طور پر مقامی آبادی کے ہاتھوں 200 مسلمان قتل ہوئے، 400 گھر جلا دیے گئے اور 11 مساجد کو شہید کیا گیا۔

1962ء سے میانمار فوجی حکومت کے زیر اثر تھا۔ 2010ء میں الیکشن ہوئے جس کے نتیجے میں طویل آمریت کا یہ سورج 2011ء میں غروب ہوا اور ملک میں ایک جمہوری حکومت تشکیل دی گئی۔ اس دوران روہنگیا مسلمانوں نے بھی اپنے بنیادی انسانی حقوق اور شہریت کا مطالبہ دہرایا لیکن بڑی سختی کے ساتھ یہ آواز دبا دی گئی۔

2012ء میں Rakhine صوبے میں پھر سے فسادات پھوٹے۔ یہ فسادات "تحریک 969" کی شر انگیزیوں کا نتیجہ تھے۔ یہ تنظیم بدھ قوم پرستوں نے تشکیل دی تھی جس کا مقصد مسلمانوں کا قتل عام تھا۔ اس کا لیڈر Ashin Wirathu نامی ایک راہب ہے جو میانمار میں اسلام اور مسلمانوں کی افزائش سے سخت نالاں ہے۔ یہ شخص مقامی برمیوں کو مسلمانوں کی نسل کشی کی ترغیب دیتا اور ان سے میل جول سے سختی سے گریز کی تلقین کرتا ہے۔ اس نے برمیوں کو مسلم دکانداروں سے خرید و فروخت سے قطعاً گریز کرنے کا پابند بنا رکھا ہے تاکہ مسلمانوں کو معاشی طور پر بھی مفلوج کیا جا سکے۔

2012ء کے فسادات میں تقریباً ایک لاکھ 25 ہزار مسلمان لاپتہ ہوئے جو پھر کبھی نہ مل سکے۔ یہ خونی فسادات جن میں تمام تر نقصان مسلمانوں کا ہی ہوتا ہے اور برمیوں کا نہ تو ان میں کوئی نقصان ہوتا ہے اور نہ ہی خون ریزی کرنے پر ان پر کوئی فرد جرم عائد ہوتی ہے۔ ایسے فسادات محض ایک معمولی واقعے کی آڑ میں ایک طے شدہ منصوبے کے تحت شروع کیے جاتے ہیں، مثلاً 2013ء کا فساد منچیتلا میں محض ایک مسلم سنار اور ایک بدھ مت کے پیروکار کی بحث سے شروع ہوا، اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ آگ سڑکوں پر پھیل گئی جس میں درجنوں مسلمان قتل کر دیے گئے۔

مئی 2012ء میں جب ایک بودھ لڑکی نے اسلام قبول کر لیا تو وہاں کے بدھسٹوں نے لڑکی کو گھر بدر کر دیا، لڑکی نے مسلم آبادی میں پناہ لی۔ چند دن بعد اس لڑکی کی لاش ملی جسے زیادتی کے بعد قتل کیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے الزام لگایا کہ بودھوں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے اسے قتل کیا ہے جب کہ بودھوں نے تین مسلمان نوجوانوں کو اس قتل کا ذمہ دار قرار دے دیا۔ جس نے علاقے کے حالات کافی کشیدہ کر دیے۔ اس کے بعد ۳ جون 2012ء کو بودھ بھکشوؤں نے زائرین کی ایک بس روکی اور اس میں سے عمرہ کی ادائیگی کر کے واپس آنے والے 10 علما کو باہر نکال کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور بس جلا دی۔ ساتھ ہی ساتھ بودھوں کی جانب سے مسلم اکثریتی علاقوں پر بھی دھاوا بول دیا گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کی تنظیموں نے بھی اس قتلِ عام پر بہت واویلا کیا مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ پہلے پہل تو مقامی حکومت کی جانب سے اسے صاف جھٹلا کر حیلے بہانے کیے جاتے رہے اور متاثرہ علاقوں میں کرفیو لگا دیا اور فوج بھیج کر صحافیوں کو فساد زدہ علاقوں سے نکال دیا گیا۔ مگر اگست 2012ء میں برطانوی ٹی وی چینل 'چینل فور' نے ایک دستاویزی رپورٹ نشر کی جس میں دکھایا گیا کہ کس طرح مسلمان، کیمپوں میں جانوروں والی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس کے علاوہ رپورٹ میں قریباً ۱۰ ہزار مکانات کا ملبہ بھی دکھایا گیا جس کے بعد اقوامِ متحدہ کے ادارۂ برائے پناہ گزین نے اپنی رپورٹ جاری کی جس کے مطابق تشدد کی اس لہر میں کم از کم 80 ہزار مسلمان اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اقوامِ متحدہ کی ایک اعلیٰ عہدیدار 'نوی پلے' نے انتظامیہ کے سلوک و رویے کے حوالے سے بھی ایک رپورٹ دی کہ مقامی پولیس اور بدامنی پر قابو پانے کیلئے بھیجے جانے والی فوج بھی بے گناہ مسلمانوں کو ہی نشانہ بنا رہی ہے۔ پھر جولائی 2012ء میں برطانوی نشریاتی ادارے نے بنگلادیش کے کیمپوں میں مقیم روہنگیا مسلمانوں پر ایک رپورٹ شائع کی جس میں اکثر نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو میانمار کی فوج نے قتل کیا۔

اکتوبر 2012ء میں جب مسلم ممالک کی تنظیم او آئی سی نے مسلمانوں کی مدد کے لیے میانمار میں دفتر کھولنے کی اجازت طلب کی تو میانمار کے صدر نے نہ صرف اجازت دینے سے انکار کر دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ اس طرح کے دفاتر "لوگوں کی خواہشات" سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ہیومن رائٹس واچ نے بارہا عالمی برادری کے سامنے بے شمار ٹھوس دستاویزی اور تصویری ثبوت پیش بھی کیے اور اس ضمن میں اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون سے بھی اپیل کی کہ وہ تشدد روکنے میں اپنا کردار ادا کریں لیکن ساری کوششیں بے سود رہیں۔ دوسری جانب میانمار کی عالمی شہرت یافتہ رہنما "آنگ سان سوچی" نے مسلمانوں کو "صبر" کی تلقین کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ "رہنما کو مسائل کی بنیاد دیکھے بغیر کسی خاص مقصد کے لیے

کھڑے نہیں ہو جانا چاہیے"، انسانی حقوق کی تمام تنظیموں نے اس پر سوچی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ انہیں اس قسم کے ردعمل پر سخت مایوسی ہوئی ہے۔ پھر 2012ء میں عین عید الاضحیٰ کے موقع پر جانوروں کو ذبح کرنے پر پابندی لگادی گئی جس کے نتیجہ میں عید کے روز ہونے والے فساد میں 50 مسلمان جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ویسے بھی جہاں انسانوں کا گلا کاٹا جارہا ہو وہاں سنتِ ابراہیمی کی یاد میں جانور نہ کاٹنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور فرق پڑتا ہی کسے ہے، تمام عالم ہی چپ چاپ تماشا دیکھنے میں مصروف ہے۔ میانمار کی حکومت اور اس کا موقف کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میانمار کے صدر نے تو جولائی 2012ء میں میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ "اس سارے مسئلے کا حل صرف یہی ہے کہ یا تو مسلمانوں کو ملک بدر کیا جائے یا پھر انہیں مہاجر کیمپوں میں منتقل کیا جائے"۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل، ہیومن رائٹس واچ اور اقوامِ متحدہ سمیت کئی عالمی اداروں نے حکومت سے غیر جانبدارانہ تحقیقات کا بارہا مطالبہ کیا مگر ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیا جاتا رہا۔ ان عالمی اداروں کی کاوشوں سے فسادات کی تحقیقات کے لیے 2012ء میں مسلمانوں، بودھوں، عالمی اور مقامی لوگوں پر مشتمل ایک کمیشن بھی تشکیل دیا گیا مگر عین وقت پر میانمار کی حکومت نے اقوامِ متحدہ کی قیادت میں کمیشن کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ پھر ان فسادات میں ایک ٹھہراؤ سا آگیا لیکن بعد میں یہ ثابت ہوا کہ یہ ٹھہراؤ ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا کیونکہ اس کے بعد فسادات کی لہر "راکھین" سے نکل کر ملک کے سب سے بڑے شہر رنگون تک پہنچ گئی۔ اس تمام عرصے کے دوران متاثرہ علاقوں میں کرفیو لگا رہا۔

اسی دوران 2013ء میں مسلمانوں کی نسل کشی کے لیے میانمار کے دو صوبوں میں ایک سے زیادہ بچے پیدا کرنے پر بھی پابندی عائد کردی گئی جب کہ ان کے خلاف قتل و غارت گری کا بازار گرم کرنے کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

شرع یہ کہتی ہے کہ جب تم پر زمین تنگ کردی جائے تو ہجرت کر جاؤ، روہنگیائی ہجرت کرکے بنگلادیش پہنچے جہاں پر ان کا گولیوں کے ساتھ استقبال کیا گیا، کئی مر گئے، کچھ زخمی ہوئے مگر مجال کہ کسی نے دنیا کے اس سوتیلے بچے کو جسے اس کا ملک بھی تسلیم نہیں کرتا، اپنانے میں حامی بھری ہو۔ انڈونیشیا، ملائشیا، تھائی لینڈ، سنگاپور، سری لنکا، کون سا ایسا ملک تھا جہاں انہوں نے رحم طلب نگاہوں سے پناہ کی اپیل نہ کی ہو۔ یہ تو فطرتِ انسانی ہے کہ وہ مہمان کو بھی چند دن سے زیادہ قبول نہیں کرتی۔ اسی لیے بنگلادیشی حکومت نے اپنا اصل رخ دکھایا اور جو پناہ گزین بنگلادیش میں محصور تھے انہیں فوری طور پر بنگلادیش سے نکل جانے کو کہا۔ یہ ساڑھے تین ہزار افراد خدا کے سہارے کشتیوں میں بیٹھ کر نکل پڑے کہ شاید کوئی ان پر مہربان ہو جائے مگر یہ تو دنیا کے لیے ایک پنگ پانگ بال کی حیثیت رکھتے تھے، بنگلادیش نے بال کو ہٹ کیا تو یہ سری لنکا پہنچے، وہاں سے ہٹ ہوئے تو تھائی لینڈ، وہاں سے ملائیشیا، وہاں سے انڈونیشیا، وہاں سے سنگاپور۔ دنیا کو کیا فکر کہ یہ انسانوں کی بات ہو رہی ہے، ان کے بھی کچھ حقوق ہیں، سب کو اپنا بارڈر محفوظ اور پناہ گزین سے پاک چاہیے تھا۔

برما میں روہنگیا مسلمانوں کا قتل ایک معمول بن چکا ہے۔ بچے بوڑھے خواتین کوئی محفوظ نہیں ہے. ان کے حوصلے پست کرنے کے لیے ان کی لڑکیوں اور معصوم بچیوں تک کی آبروریزی کی جارہی ہے۔ انتہائی تکلیف دہ بات یہ ہے کہ بودھ آبادی کے ساتھ ساتھ وہاں کی پولیس اور فوج بھی ان مظلوم انسانوں کو دکھ کی بھٹی میں جھونکنے میں پیش پیش ہے۔ اور کبھی خاموش تماشائی بن کر بودھ بلوائیوں کے حملوں اور ان کے قتل عام کو دیکھتی رہتی ہے، اور کبھی خود ان کا حصہ بن جاتی ہے۔ تقریباً ایک لاکھ مسلمان تھائی لینڈ کے کیمپوں میں گل سڑ رہے ہیں۔ ماضی میں تھائی لینڈ پر بھی یہ الزام ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ان پناہ گزینوں کو زبردستی کشتیوں میں بٹھا کر سمندر میں دھکیل دیتا ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے مطابق روہنگیا مسلمان انسانی حقوق کی شدید قسم کی خلاف ورزی کا شکار ہیں۔ انہیں انسانی حقوق سے محروم کردیا گیا ہے۔ وہ بغیر اجازت سفر بھی نہیں کرسکتے۔ کیمپوں میں رہنے والے انسان جانوروں سے بھی بدترین زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر کوئی ملک انہیں امداد پہنچانے کا بھی خواہش مند ہو تو اس کے راستے میں حکومتی سطح پر بھی رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ ایسے علاقوں میں صحافیوں تک کو جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ کسی گھر کے سات افراد تو کسی گھر کے آٹھ افراد قتل کر دیے گئے ہیں۔ اقوام متحدہ نے اپنی ایک رپورٹ میں روہنگیا مسلمانوں کو روئے عالم کی مظلوم ترین اقلیت قرار دے رکھا ہے۔ برما واحد ملک ہے جو مذہبی عناد کی وجہ سے مسلمانوں کو شہری تسلیم کرنے سے گریزاں ہے۔ روہنگیا مسلمانوں کو انسان سمجھا جاتا تو شاید کوئی دبی سی آواز ان پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم پر بھی اٹھتی لیکن شاید دنیا کے امن و آشتی کا راگ الاپنے والے لوگ انہیں انسان تو کیا جانور بھی نہیں سمجھتے۔ انسانی حقوق کی علمبردار تنظیمیں ان سے منہ پھیر کر بیٹھی ہیں، اور دنیا کو امن، صبر اور شانتی کا پیغام دینے والے انسان کے پیروکار سفاکی سے ان مظلوموں کو دکھ، زخم اور گھاؤ تقسیم کررہے ہیں۔ ■■■

نظر فکر و

شاعری میں تصوّف کی جلوہ ریزیاں

بزمِ دانش میں آپ ہر ماہ بدلتے حالات اور ابھرتے مسائل پر فکر و بصیرت سے لبریز نگارشات پڑھ رہے ہیں۔ ہم اربابِ قلم اور علمائے اسلام کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ دیے گئے موضوعات پر اپنی گراں قدر اور جامع تحریریں ارسال فرمائیں۔ غیر معیاری اور تاخیر سے موصول ہونے والی تحریروں کی اشاعت سے ہم قبل از وقت معذرت خواہ ہیں۔ از: مبارک حسین مصباحی

اگست ۲۰۱۷ء کا عنوان	مدارسِ اسلامیہ کے فارغین اور ان کی تدریسی ذمہ داریاں
ستمبر ۲۰۱۷ء کا عنوان	عیدالاضحیٰ: حقیقت اور پیغام

تصوف اور تصورِ عشق: صوفیانہ شاعری کے حوالے سے

از: ڈاکٹر محی الدین حبیبی، حیدرآباد، دکن

محبت کے انتہائی درجہ کا نام "عشق" کہلاتا ہے۔ یہ ایک مقام بلند ہے، جسے مل گیا سو مل گیا، پھر مل گیا تو بامراد ہو گیا۔ "عشق" ایک شدتِ رغبت، کشش، لگاؤ اور لگاوٹ ہی کا نام نہیں، بلکہ اپنی رضا معشوق کی رضا کے مطابق، اپنی آرزو حبیب کی آرزو پر نثار، اپنی تمنا یار کی تمنا پر نثار اور خود کو "یار" کے لیے خود رفتہ کر لینے اور یار پر فریفتہ و فدا ہو جانے کا نام ہے۔ ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب جانے کا نام ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے۔

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

عشق انسان ہی کے لیے خاص ہے، وہ بھی انسان کامل کے لیے یہ عشق "بندہ" اور "رب" کے درمیان کا عشق ہے، جو معرفت کا طلب گار ہے، جو قربِ الٰہی کا آرزومند ہے، جمالِ یار کا مشتاق ہے۔ یہ دیدۂ دیدار، یہ تمنائے قربِ یار، یہ اضطراب، یہ تب و تاب، فرشتوں کو بھی نصیب نہیں ہے۔

قدسیاں را عشق ست و درد نیست
درد را جز آدمی در خورد نیست

یہ اضطراب، یہ سوز و سازِ نہانی، یہ دولتِ درد صرف انسان ہی کا حصہ ہے، اس لیے عشق کی مدح سرائی یوں کی گئی ہے۔

مرحبا اے عشق سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

عشق کی صوفیانہ تعریف ہی کی معنویت نے ہر سالک یا عارف کو "عاشق" بنا دیا، کیوں کہ وجودِ حقیقی ایک ہے اور کائنات میں سب کچھ اسی کی صفت کا کسی نہ کسی صورت میں "پرتو" ہے۔

حسن خویش از روے خوباں آشکارا کردۂ
پس بہ چشم عاشقاں خود را تماشہ کردۂ

گویا معلوم ہو گیا کہ شاہد اور مشہود اور طالب و مطلوب کی اصل ایک ہی ہے تو صوفیانہ نقطۂ نظر سے "عشق حقیقی، اپنے کمال کی جانب میلان و رجحان رکھے گا۔

عشق صورت نیست عشق معرفت

صوفیائے کرام کے افکار کا مطالعہ کرنے پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک گروہ "خوفِ الٰہی" سے تقویٰ قائم کرنے کا قائل ہے تو دوسرا محبت کے نغمے گاتا ہے اور الوہی نغمات کے وسیلہ سے انس

حاصل کرتا ہے، کرم وفضل کا تمنائی ہے، ظاہر ہے خوفِ الٰہی کا گروہ جلال و جبروت و کبریائی کے آگے لرزہ براندام ہے اور سرمو غفلت نہیں برتنا نہیں چاہتا، جب کہ محبت وعشق و فریفتگی کا گروہ اپنی بے سروسامانی اور آشفتہ سری کے ساتھ جمالِ الٰہی سے اقتباسِ نور کرتا ہے، منور ہوتا ہے، روشنی بھی بانٹتا ہے، سرمست و بے خود ہوجاتا ہے۔ صوفیانہ شاعری میں یہ تخویف، یہ حزن و ملال اور یہ سرمستی، سرشاری اور یہ ہجر ووصال کے نغمے برابر گونجتے ہیں۔

حضرت رابعہ بصری کی یہ مناجات تو زبان زد خاص وعام ہے۔

"اے میرے معبود! اگر میں تری عبادت جہنم کے خوف سے کرتی ہوں تو مجھے نارِ جہنم کا لقمہ بنادے۔ اگر میں تری عبادت جنت کی لالچ سے کرتی ہوں تو مجھے ہمیشہ کے لیے اس سے محروم کردے۔"

اگر میں صرف تجھ سے تری ذات سے ترے لیے محبت کرتی ہوں تو اے میرے مولیٰ مجھے اپنے "جمالِ ازلی" سے محروم نہ کیجیو! گویا رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا نے صوفیوں کو عشق حقیقی کا درس دیا۔ جب ہی تو ہم دیکھتے ہیں عشق کی یہی روح متاخرین صوفیائے کرام میں سرایت کرگئی، چاہے وہ صوفی باصفا ہوں یا صوفی شعرا ہوں، سبھوں نے اسی مسلکِ عشق کی شدت کے ساتھ اتباع کی۔

ان عاشقانِ راہِ طریقت کی فہرست بڑی طویل ہے۔ موضوع کی مناسبت سے چند کا انتخاب کیا گیا ہے اور تقدیم و تاخیر کا بھی حتی المقدور خیال رکھا گیا ہے، پھر بھی روانی میں کچھ نفس مضمون زیر و زبر ہوسکتا ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے بڑے صوفی شعرا میں شیخ ابوسعید ابوالخیر قدس سرہ اپنی رباعیات کے حوالہ سے خاص مقام رکھتے ہیں۔ حکیم سنائی "حدیقہ اور سیر العبا سے پہچانے جاتے ہیں۔ نظامی خمسہ نظامی کے ذریعہ اور فریدالدین عطار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ "منطق الطیر" کی وساطت سے صوفیانہ شاعری میں بلند مقامات پر فائز نظر آتے ہیں۔ مثنوی مولانا روم کا تو کیا کہنا وہ تو "ہست قرآن در زباں پہلوی" والی بات ہے۔ رنگ و تغزل میں یہ وہ صوفی شعرا ہیں جو "وصول الی اللہ" کی منزلوں سے باریاب ہوئے تھے۔ یہ صرف "مست قال" نظر نہیں آتے، بلکہ "صاحبانِ دل اور اربابِ حال" اور علم تصوف کے اولوالالباب تھے۔

یہ "روح بیدار" دلِ زندہ کی صفت کے حامل تھے، جو "ہوش یاری بیچ کر عشق کی حیرانی اور مستی خرید لیتے تھے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا حال یہ تھا کہ آتش محبت میں غرق رہتے، ان کا سارا سراپا مجاہدۂ نفس کی آگ میں جھلسا رہتا اور دل دمشاہدات میں جما رہتا۔ اس مجاہدانہ ماحول میں مناجات سے جو روشنی چھن چھن کر پردہ کے باہر نکلتی، وہ عشق کی جلوہ سامانیوں کی یہ سوغات لے آتی۔ سننے والا، سنانے والا سب ہی مدہوش ہوتے بے ہوش جاتے، بلکہ درجۂ فنا تک پہنچ جاتے اور حق کے ساتھ باقی رہ جاتے۔ سنئے شب کی تنہائی میں سجدہ ریز ہوکر بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کیا مانگ رہے ہیں:

اے میرے مولیٰ اے میرے مالک! اے میرے رب! یہ "من وتو" یہ "میں اور تو" کب تک؟ یہ "من و تو" درمیان سے ہٹا دے۔ اب ہٹا ہی دے کہ میرا "من" تجھ سے جڑ جائے اور "میں میں نہ رہوں۔ پروردگار! میں سب سے زیادہ اور طاقت ور ہوں جب تک تو میرے ساتھ ہے اور جب اپنے ساتھ ہوں کمزور ہوں، ضعیف ہوں۔ الٰہی یہ زاہدی مجھے درکار نہیں، یہ عالمی کی حاجت نہیں! ہاں اگر تو چاہے کہ میں بھی ترے اہلِ خیر میں شامل ہوجاؤں جنہیں تو پہلے سے پہنچار کھا ہے تو پھر مجھے ان دوستوں تک پہنچادے کہ میں ہی تجھ پر نازاں رہوں۔ مرے مولیٰ! فطرتِ دل پر ترے یہ الہام کتنے بھلے لگتے ہیں۔" (بحوالۂ کائنات تصوف)

حضرت بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی یہ مناجات، عشق کی مناجات ہے، دل کی پکار ہے، عشق و سرور میں ڈوبے ہوئے اور کشف و وجدان میں ڈوبے ہوئے الفاظ ہیں، جو الہامی تاثیر و تاثر کے ساتھ ادا ہوئے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے رازونیازِ عشق دیکھیے۔

و لا تنظر العین الا إلیه
و لا یقع الحکم الا علیه

(آنکھ دیکھتی ہے تو بس اسی کو دیکھتی ہے، حکم لگتا ہے تو اسی پر لگتا ہے، ہم اسی کے لیے ہیں، اور ہماری پہچان اسی سے ہے، ہم اسی سے ہیں، اسی کے دستِ قدرت میں اور ہر حال میں اس کے پاس ہیں۔)

کیا قرب ہے، کیا ناز ہے، کیسی سپردگی، کیا شیفتگی اور فریفتگی کا عالم ہے، بندہ نیاز مند ہے اور "بے نیاز" کو منا رہا ہے، اپنا تعلق جتا رہا ہے، قدیم رشتہ کی بات کررہا ہے کہ "ہم تم تو ایک ہی تھے" تم کو پہچان کی تڑپ ہوئی تو ہماری تخلیق ہوئی، پھر ہم ہی پر عاشق ہوئے۔

کون عاشق ہے، کون معشوق ہے، کون ساجد ہے، کون مسجود ہے، کس نے عالمِ ارواح میں "الست بربکم" کہہ کر پکارا تھا اور کس نے "قالو بلیٰ" کا پرشگاف نعرہ کہلوایا تھا، کس نے ملائک سے سجدہ کروایا تھا۔

ملائک بھی ہمیشہ چومتے تھے پائے اقدس کو
نہیں معلوم کیا رکھا تھا حق نے ذاتِ انساں میں (حبیبؔ)

حکیم سنائی جب عشق کی بارگاہ میں آئے تو رفتار ہی بدل گئی:

طلب اے عاشقاں خوش رفتار
طرب اے نیکواں شیریں کار

کہ ایک عاشقانِ خوش گفتار و رفتار اپنے کشکول تمنا لیے مانگنے کے لیے ہاتھ پھیلائے اور خوش کاری کے عمل کو خوش انجامی تک پہنچائے یہ ایک طرب انگیز و مسرت بخش کام ہے کہ تو مانگتا جا اور داتا دیتے جائیں"

فرید الدین عطار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے "منطق الطیر" کیا لکھ دی، گویا پرندوں کی زبانی "اسرارِ عشق" کھول کر رکھ دیے، کبھی وادیِ حیرت کی سیر کرادی، کبھی وادیِ محبت میں آگ لگادی، وادیِ قرب میں بھٹکا دیا۔ مولانا روم جیسا عارف العارفین عطار کے مشامِ جاں سے معطر ہو کر کہہ اٹھتا ہے۔

ہفت شہر عشق را عطار گشت
ما ہما اندر خم ایک کوچہ ایم

سعدی علیہ الرحمۃ کے عاشقانہ ارتسامات اور "حقیقتِ محمدی" جو "معرفتِ الٰہیہ" کے لیے لازمی ہے، اس کے اظہار کے لیے یہ دو بیت ہی ہم تمام کے لیے ایک عظیم نعتیہ سوغات ہے۔

بلغ العلیٰ بکماله کشف الدّجیٰ بجماله
حسنت جمیع خصاله صلّوا علیه و آله

خاقانی کی آب و تاب بھی دیکھیں۔

عشق بیش فرد پا، بر نمط کبریا
برو بہ دست نخست ہستیِ مارازما
ما و شمارا بہ نقد بے خودی خوارست
زآنکہ نہ گنجد ما و شما (خاقانی)

امیر خسرو، طوطیِ ہند کے لیے کس طوطیِ گفتار کو لایا جائے کہ ان کے تفکر و تدبر کے مقامات کو متعین کرکے ان کی وجدانی اور الہامی کیفیات کی ترجمانی اور ان کی ماورائی خود رفتگی کو ہمارے اسالیب بیان احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ بس حظ اٹھائیں:

گفتم طریقِ عاشقاں، گفتا وفاداری بود
گفتم مکن جور و جفا، گفتا کہ ایں کارِ منست
گفتم کہ مرگ ناگہاں، گفتا کہ دردِ ہجرِ من
گفتم علاجِ زندگی، گفتا کہ دیدارِ منست (خسروؔ)

"خم خانۂ تصوف" میں مست و بے خود کر دینے والا صوفی شاعر حافظ نہ ہوتا تو شاید نہ کوئی سرشار ہوتا نہ کوئی مخمور، مے کدے بند رہتے، میکدہ سازی نہ ہوتی اور نہ میکدہ بردوشی ہوتی۔ پیر مغاں اپنی پہچان کھو دیتا، رندِ خدا مست نظر نہ آتے، "خمریات" میں صوفی مصطلحات کو سمونے والا یہ عظیم شاعر عجیب و غریب نکتہ آفرینی کرتا ہے رموز و اسرار کی ایسی باریکیاں پیش کرتا ہے کہ جان پر بن آتی ہے۔

مولانا جامی تو ان مشاہیر صوفی شعراء میں ایک مقام بلند رکھتے ہیں جن کو عربی و فارسی دونوں زبانوں پر کامل دسترس تھی۔ آپ کا عاشقانہ کیف و سرور تو بس محسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

آمد سحراں دلبر خونیں جگراں
گفت اے ز تو بر خاطر من بار گراں
شرمت بادہ کی من سویت نگراں
ماشم، تو کنی، چشم سوئے دگراں (جامی)

یہی جذباتِ عشق جب فارسی سے زبان اردو میں آئے تو سراج اورنگ آبادی نے کہا:

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو، رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی (سراجؔ)

درد کا تو صوفی شعرائے اردو میں ایک خاص مقام ہے۔ بھلا وہ اس عشق کی آگ میں کب نہ جلتے؟

برنگِ شعلہ، غمِ عشق ہم سے روشن ہے
کہ بے قراری کو ہم برقرار رکھتے ہیں
ہے عشق سے میرے، یہ ترے حسن کا شہرہ
میں کچھ نہیں، پر، گرمیِ بازار ہوں ترا (دردؔ)

غالب، گلشن ناآفریدہ کا عندلیب جو ٹھہرا، بھلا وہ عشق کی جناب میں نغمہ خواں کیوں نہ ہوتا۔ اُس نے پردے اٹھائے بھی ہیں اور پردوں کو چاک بھی کیا ہے۔ تعینات کو تک متعین کرنے کی کوشش کی

ہے۔ پتہ نہیں ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ فنا ملی، بقا ملی، یہ صرف فنا ہوکر رہ گئے؟ وہ بھی منصور کی طرح "اناالحق" کے طرفدار ہیں، لیکن اس عاشق کا انداز جداگانہ ہے:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفی منصور نہیں

پھر یہ شعر دیکھیں کس طرح کس طرح کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق (میں ایک مخفی خزانہ تھا، مجھے اس بات سے محبت ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں، لہٰذا میں نے مخلوق پیدا کی) حدیثِ نبویؐ کی ترجمانی کردی:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

پھر دوسری جگہ "الوہی عشق" کا اظہار جس تعلقِ خاطر سے کیا ہے یہ غالب ہی کا اوجِ سخن ہے جس پر وہ اکیلے ہی فائز نظر آتے ہیں:

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا

غالب کے بعد ہم صرف ان کے قریبی دور کے شاعر خواجہ حبیب علی شاہ حبیب ۱۲۳۶ھ تا ۱۳۲۳ھ کے کلام معرفت نظام سے چند اشعار پیش کریں گے، ورنہ بیسویں صدی کے کئی اہم شعرا جیسے اقبال، سیماب، فانی، جگر، اصغر، حسرت، ریاض، خیر آبادی، امجد حیدر آبادی اور کامل شطاری ایسے بہت سے نام ہیں جو اس مضمون میں عدم گنجائش کے باعث جگہ نہ پاسکیں گے، جس کے لیے ایک علیحدہ مقالے کی ضرورت ہے، جو انشاء اللہ مستقبل قریب میں پیش کیا جائے گا، ویسے حبیب الارشاد میں خواجہ حبیب ارشاد فرماتے ہیں: "طالب صادق را دو چیزے کار است یکے عشق و دیگر ادب" یعنی طالبِ راہِ طریقت کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک عشق دوسرے ادب یا حسن خلق۔ جب سالک عشق سے دوچار ہوتا ہے تو پا برہنہ، چاک گریباں، چہرۂ خاک آلود، بادل سوختہ، چشم گریاں، آہ سوزاں اور نالہ و فریاد کرتا ہوا واشوقا واحسرتا کا نعرہ مارتا ہوتا کہتا ہے:

من در فراقت چوں شدم دیوانہ و مجنوں شدم
صد پارہ دارم پیرہن در عشق تو دیوانہ ام (حبیبؔ)

ایک اور مقام پر کہا ہے۔

عشقت از ماہ و سال می دارم
آرزوئے وصال می دارم (حبیبؔ)

راہِ عشق میں داغ ہائے سینہ و سوزِ جگر کی بھی پرواہ نہ کی اور اپنی دیوانگی اور وارفتگی کو ظاہر کیا۔

منم آں عاشقِ دیوانہ ہستم
بہ شمع روئے خود پروانہ ہستم (حبیبؔ)

"عشق" ایک کائناتی حقیقت ہے، جو ماورائی قدروں سے متعلق ہوتی ہے، جہاں بعض قدریں بھی اپنی وسعت کے ساتھ نظر آتی ہیں۔

حبیب از اوّلیں پابند عشقم
مسلماں نیستم نے بت پرستم

آپ کے مرشد و ہادی حضرت حافظ سید محمد علی شاہ خیر آبادی علیہ الرحمۃ کے تین خلفاے مجاز تھے: (۱) خواجہ حبیب علی شاہ علیہ الرحمۃ (۲) حضرت سردار بیگ علیہ الرحمۃ (۳) مولانا احسن الزماں علیہ الرحمۃ۔ تینوں ہم عصر تھے اور اپنے مرشد سے ایک ایک نعمت پائے تھے۔ حبیب علی شاہ علیہ الرحمۃ کو "عشق" کی نعمت ملی، سردار بیگ علیہ الرحمۃ کو "جامِ توحید" اور مولانا احسن الزماں علیہ الرحمۃ کو "علومِ شریعت"۔ یہی وجہ ہے کہ خواجہ حبیب جلوت و خلوت میں قال و حال میں، بہرحال ہر کیفیت میں "عشق" کے مغلوب نظر آتے ہیں۔ "عشق" ہی ان کا رہنما، رہبر اور "پیر مغاں" معلوم ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جس ارادت مند کا مرشد عشق ہو اس کو جمالِ یار ہی نہیں "وصالِ یار" کا مقام بھی مل جاتا ہے۔ خود کہتے ہیں۔

عشق تو رہنمائے حریم جمال تست
دردِ یکہ داد دولت دایم بدست مفت

یہی سبب ہے کہ ان کی صوفیانہ شاعری میں حقیقی جذبۂ عشق کا عنصر غالب ہے، جو سارے دیوان کے رنگِ تغزل کو اور چوکھا کردیتا ہے۔ ان کے ہاں قوتِ اظہار کی تابش اور اسالیب کے لطفِ بیاں کی کیفیت کچھ اور ہی ستم ڈھاتی ہے اور خود قاری کو مضطرب و بے چین کردیتی ہے۔

عشق بازی، جان بازی ہے حبیب
پاتے ہیں کیا کیا دلِ بسمل میں ہم

اردو شاعری میں فلسفہ وتصوف

از: مہتاب پیامی، شعبہ کمپیوٹر، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، payamee@gmail.com

کسی نوجوان نے ایک بزرگ سے پوچھا: "صوفی شاعری کی ندرت کیا ہے؟" بزرگ نے جواب دیا۔ "انسان کا دل بنجر مٹی کی طرح سخت ہوتا ہے، جس پر کوئی موسم اثرانداز نہیں ہوتا، اسی طرح انسان کے دل پر بھی کوئی بات اثر نہیں کرتی۔ صوفی شاعری دل کو نرم کرتی ہے اور اثر قبول کرنے والا بناتی ہے۔ جب صوفیانہ شاعری کے حروف سماعتوں سے ٹکراتے ہیں اور دل انھیں محسوس کرتا ہے، تو پھر سخت مٹی نرم ہونا شروع ہوجایا کرتی ہے، بشرطیکہ یہ عارفانہ کلام سمجھ میں آجائے۔ دل جب نرم مٹی کی طرح ہوجائے، تو پھر اس میں اللہ تعالیٰ اپنی محبت کا بیج ڈالتا ہے۔ لہٰذا خدا سے عشق کی طرف جانے والے راستے کا سنگ میل "تصوف" ہی ہے۔ ایک ایسا راستہ، جس میں ذات کی نفی ہوتی ہے۔ عاجزی وانکساری شخصیت کا اثاثہ ہوتے ہیں۔"

صوفی شاعری کی اساس یہی ہے۔ یہ محبت کے وہ خوب صورت حروف ہیں، جو صرف ایمان کو تازہ ہی نہیں کرتے، بلکہ آدمی کو انسان بھی بناتے ہیں۔ برصغیر پاک وہند میں اسلام کے فروغ میں صوفیائے کرام کا بنیادی کردار رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق پلٹیں، تو بزرگانِ دین کی تعلیمات کا جامع سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ اس خطے میں بزرگوں کی آمد داتا گنج بخش علی ہجویری علیہ الرحمۃ سے شروع ہوئی، پھر مغل دور، انگریز کے تسلط کا زمانہ اور تقسیم ہند کے مرحلے سے ہوتے ہوئے موجودہ عہد تک، صوفیوں کا ایک مربوط نظام قائم رہا۔

صوفی شاعری ہر دور میں پُراثر رہی۔ برصغیر کے معروف صوفی شعرا میں سرفہرست نام، جن کی شاعری آج بھی دلوں کو چھو لیتی ہے ان میں، شاہ عبداللطیف بھٹائی، مست توکلی، خوشحال خان خٹک، بلھے شاہ، شاہ حسین، بابا فرید، میاں محمد بخش جیسے زرخیز شعرائے کرام کا کلام دلوں پر منقش ہے۔

صوفی شاعری کے فلسفے اور نظریۂ عشق کے حوالے سے معروف ادیبہ اور شاعرہ ڈاکٹر صغریٰ صدف لکھتی ہیں کہ "صوفی جمال کی راہ پر چلنے والا مسافر ہے۔ جمال کی تحریک اس کے دل میں خوابیدہ عشق کو بیدار کرتی ہے۔ صوفی کا عشق زبانی اظہار محبت پر نہیں بلکہ دیدار کا متقاضی ہے۔ وہ عشق کے سمندر میں پوری طرح غرق ہوکر ایک ہونے کو اصل وصل گردانتا ہے۔ صوفی نفی ذات کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے فنا کو بقا کی اعلیٰ شکل میں ڈھالتا ہے۔"

صوفیاء کے نزدیک عشق شکست نفس کا نام ہے۔ تصوف وحقیقت کے اس رجحان کی بدولت دبستانِ دہلی کی غزلیہ عشقیہ شاعری میں عشقِ حقیقی کی جھلک بھی ہے اور ہر مجاز کے رنگ میں حقیقت پردہ نشین ہے۔ ایسی صورتِ حال میں مجاز اور حقیقت میں فرق مشکل ہوجاتا ہے۔

خدا کی بندگی کہیے اسے یا عشقِ معشوقی
یہ نسبت ایک ہے سو سو طرح تعبیر کرتے ہیں

تصوف کی گہرے اثر کی وجہ سے لوگ ہر ذرے میں حسنِ مطلق کی تلاش کرتے ہیں۔ میر تقی میر کی مثنوی "شعلۂ عشق" کے شروع میں ہے کہ اگر محبت نہ ہوتی تو کائنات کا ظہور نہ ہوتا۔ اس کارخانے میں محبت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مثنوی "دریائے عشق" کے شروع میں بھی کچھ اسی قسم کے خیالات کے شعر ملتے ہیں۔ جس طرح مولانا روم نے مثنوی کے آغاز میں عشق کے حکیمانہ پہلو پر روشنی ڈالی ہے، میر نے بھی اپنی مثنویوں میں اس قسم کا انداز اختیار کیا ہے۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت، نہ ہوتا ظہور

میر اثر مثنوی "خواب وخیال" میں وجودی تصور پر یوں تبصرہ کرتے ہیں۔

کس کو دیکھوں کروں میں کس پہ نگاہ
سب طرف جلوہ گر ہے وجہ اللہ

کائنات اور حیات پر غور وخوض کی مثالیں یوں تو تقریباً سبھی صوفی شاعروں کے کلام میں کم وبیش موجود ہیں لیکن اس لحاظ سے خواجہ میر درد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اصل میں تصوف اور فلسفہ کے کئی ایک مباحث مشترکہ ہیں۔ فلسفیانہ مباحث میں کائنات اور حیات دو اہم موضوعات ہیں۔ ایک صوفی بھی اپنی ساری جدوجہد کائنات اور حیات کے اسرارِ سربستہ کو سمجھنے میں صرف کرتا ہے۔ فلسفہ جن مسائل کو عقل کے ذریعے حل کرتا ہے، صوفی ان کی حد تک وجدان کے سہارے پہنچنا چاہتا ہے۔ اپنی آخری منزل پر پہنچ کر دونوں ایک معلوم ہوتے ہیں اور

جس نے کہنہ حقیقت کو مکاشفات و مجاہدات اور جذبہ و وجدان کے ذریعہ پا کر اپنے احساسات کو شعر بنایا ہوگا وہ صوفی شاعر کہلائے گا۔

دہلوی شاعروں کے کلام میں کائنات، حیات اور انسان سے متعلق فکر کی جتنی مثالیں نظر آتی ہیں، اُن پر تصوف کا پرتو پڑا ہوا ہے۔ اس کے لیے عارفانہ کلام کی اصطلاح زیادہ موزوں ہے۔ خدا کے وجودی تصور، کائنات کی موہومی، خیر و شر میں تمیز، جبر و قدر کے مسئلے، قدر و قسمت، بندہ و خدا کے تعلق جیسے موضوعات پر اس دور کے چھوٹے بڑے تقریباً سبھی شاعروں نے توجہ کی ہے۔ لیکن خواجہ میر درد، شاہ حاتم اور میر محمدی بیدار کے کلام میں ان کی کثرت ہے اور ان میں بھی خواجہ میر درد کو اہم حیثیت حاصل ہے۔ خواجہ میر درد محض نظریاتی نہیں بلکہ عملی صوفی بھی تھے اور انہوں نے جن مسائل کی معرفت حاصل کی ہے، اُن پر اپنی مشہور کتاب 'علم الکتاب' میں روشنی بھی ڈالی ہے۔ فلسفی پہلے اشیا کی حقیقت کا ادراک عقل سے کرتا ہے اور پھر اپنے نتائج کو ہمارے سامنے لاتا ہے، صوفی اس کے برعکس پہلے چیزوں کو وجدان اور کشف کے ذریعے پاتا یا دیکھتا ہے اور پھر دوسروں کو سمجھانے کے لیے دلیل اور عقل کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ درد کی شاعری انہی دیکھی ہوئی چیزوں کے شاعرانہ ابلاغ کا مجموعہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

پھولے گا اس زبان میں بھی گلزارِ معرفت
یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا
تا قیامت نہیں مٹنے کا دلِ عالم سے
درد ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں

خواجہ میر درد دہلی کے ان معروف شعرا میں سے ہیں جن کی وجہ سے دہلی کی عمارتِ سخن قائم تھی۔ میر دردؔ کو کئی اعتبار سے امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک بلند فکر، درویش صفت اور صاحبِ حال انسان تھے جن کی زندگی توکل کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ درد نے جب شاعری کی دنیا میں اپنا کمال دکھایا تو اردو شاعری رنگِ تغزل کے ساتھ ساتھ رنگِ تصوف سے بھی مالا مال ہوگئی۔ ان کی شاعری میں ایک طرف تصوف کا گلاب مہک رہا ہے تو دوسری طرف معرفت کے موتی چمک رہے ہیں۔ کہساروں کا سا تکلم، آبشاروں کا سا ترنّم اور چاندنی جیسی پاکیزگی ان کے کلام کو معطر و منور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو دنیائے سخن میں شہنشائے تصوف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور عام معاصر اور متاخر تذکرہ نگار ان کا ذکر کمالِ احترام سے کرتے ہیں۔

خواجہ میر درد کی زندگی اور شاعری دونوں تصوف کے انوار میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اسی لئے وہ اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر کہلاتے ہیں۔ ان کا منفرد اندازِ بیان ان کو دیگر صوفی شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ اپنے طرزِ فکر کو نرم و ملائم مصرعوں میں بیان کرتے ہیں جو ان کی قلبی کیفیتوں کا آئینہ دار ہیں۔ بطور امثال۔

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے
تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے

دردؔ کے کلام میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کا رنگ کچھ اس طرح سے ہم آہنگ ہے کہ ان دونوں میں امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ درد کا کمال یہ کہ ان اشعار کے مطالعے کے بعد قاری کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ محبوبِ حقیقی سے ہمکلام ہیں یا محبوبِ مجازی سے۔ مثال کے طور پر۔

اپنے ملنے سے منع مت کر
اس میں بے اختیار ہیں ہم
جی کی جی میں رہی بات نہ ہونے پائی
حیف ہے ان سے ملاقات نہ ہونے پائی

دردؔ کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ ان کی نگاہ میں کائنات کا ہر ذرّہ جمالِ نورِ خداوندی کا مظہر ہے اور ہر شے میں ایک ہی ہستی جلوہ گر ہے۔ بقول درد۔

جوں نورِ بصر تیرا تصور
تھا پیشِ نظر جدھر گئے ہم
بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ
بندہ گر آوے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ

صوفی شاعروں کی فہرست میں ڈاکٹر اقبال کا نام بھی انتہائی ادب و احترام سے لیا جاتا ہے، اُنہوں نے کلام کے عکس میں اِس امّت کو ایک پاکیزہ نسل عطا کی، اس دنیا کے شاہینوں کو اُڑان اور پرواز سکھائی، نوجوانوں کی بلندیوں سے ہمکنار کرایا، ایک قوم کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرایا اور ان افراد کو خودی سے نوازا جو اپنی لاشیں اپنے ہی کاندھوں پر اُٹھائے استحکام سے عاری سماج میں گردش کر رہے تھے۔

اس قدر رمزِ خودی سے آشنا کوئی نہ تھا
راہِ حق میں نازش بانگ درا کوئی نہ تھا

خوابِ غفلت سے جو اہلِ درد کو چونکا گیا
صرف وہ اقبال تھا اس کے سوا کوئی نہ تھا

اقبال فطرتاً فلسفیانہ سوچ کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں منفرد اور فطری اندازِ بیان اختیار کرتے ہوئے اشعار کو تفکرات کا آئینہ دار بنایا۔ پہلی مرتبہ اردو غزل گوئی میں فلسفیانہ خیالات کو لفظوں کے احاطے میں مقید کیا اور اسلامی' نفسیاتی' تہذیبی' اخلاقی' سیاسی اور سماجی نظریات کو غزلوں کا رنگ دیا۔

شاعرِ مشرق اقبالؔ کے کلام میں فلسفہ خودی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ وہ استحکام سے عاری بے یقین اور مایوس قوم کا علاج خودی کی تعلیم کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نظریہ کے مطابق اپنی ذات کے ادراک و عرفان کے بغیر قوم کا جذبہ محرکہ سرد پڑ جاتا ہے۔ ان کے نزدیک خودی یقین کی گہرائی' سوزِ حیات' ذوقِ تخلیق اور ایک عبادت ہے۔ ان کے کلام سے ان کی یہ سوچ جھلکتی ہے۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریِ کائنات
یہ موجِ نفس کیا ہے' تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

اقبالؔ کی شاعری میں عشقِ حقیقی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اُن کے نزدیک عشق ایک والہانہ کیفیت کا نام ہے جو کسی مسلمان کو اپنے قصد و مقصد کی تکمیل کرنے میں سہارا دیتی ہے۔ عشق ایک متحرک قوت ہے جو مردِ مومن کو خوب سے خوب تر کی تلاش میں مصروف رکھتی ہے۔ اقبالؔ کا نظریہ یہ ہے کہ عقل اور عشق دو متضاد قویٰ ہیں۔ عقل انسان کو مصلحتوں کے آئینے میں پیچھے ہٹنے پر مجبور کرتی ہے جبکہ عشق اُسے ڈوبتے ہوئے آفتاب جلوہ گر کرنے کی ذمہ داری سونپتا ہے۔ اُن کے کلام میں اِن کیفیات کا رنگ نظر آتا ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلین ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بُت کدہ تصوّرات
عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھتا تھا میں

اِقبال برصغیر ہی کے نہیں بنی نوعِ انسان کی لازوال تہذیب کے ایک برگزیدہ مفکر اور شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ پروفیسر احتشام حسین رقم طراز ہیں:

اقبال نے ہمیں وہ لب و لہجہ اور آہنگ عطا کیا جو کرۂ ارض پر انسانی اقوام کی تقدیر بدل دیتا ہے۔ اردو شاعری میں ایسا لب و لہجہ اور آہنگ پہلے کبھی نہیں تھا۔

اقبال اور تصوف ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت لکھا گیا ہے۔ اس موضوع پر بات کرنے والوں میں دونوں طرح کے موقف کے حاملین شامل ہیں۔ یہ بھی لکھا گیا کہ اقبال کا تصوف سے تعلق ہی نہیں ہے بلکہ اقبال نے تو تصوف کو اسلام کی سرزمین پر ایک اجنبی پودا قرار دیا ہے، حالانکہ یہ بات ایک مغالطے پر مبنی ہے، اقبالؔ نے ایسا کبھی نہیں کہا، اور یہ کہ علامہ نے تصوف کو ہی ان تین بنیادی عوامل میں سے ایک قرار دیا جو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے زوال کا باعث بنے: یہ عوامل ملوکیت، ملائیت اور تصوف ہیں۔ بالِ جبریل میں علامہ نے فرمایا:

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

لیکن اس کے ساتھ ایک موقف یہ بھی ہے کہ اقبالؔ کا نہ صرف تصوف سے تعلق ہے بلکہ اقبالؔ خود بھی ایک صاحب حال صوفی ہیں اور اس کے لیے بھی ہمارے پاس اقبالؔ کی زندگی، اقبال کے علمی آثار اور شاعری میں بیسیوں شواہد موجود ہیں۔

جب تصوف کی بات ہوتی ہے تو ہمارے سامنے تصوف کی تین جہات سامنے آتی ہیں۔ تصوف کا ایک پہلو تعمیرِ اخلاق ہے یعنی تصوف کا مقصود انسانی شخصیت میں اخلاقی اوصاف و محاسن پیدا کرنا ہے جیسا کہ تصوف کی امہات کتب اور صوفیہ کی تعلیمات سے ظاہر ہے۔ دوسری جہت میں تصوف ماورائے حواس حقائق کے مشاہدے کا وہ منہج ہے جس کے ذریعے وہ دینی حقائق جو عام آدمی کے لیے صرف معلومات کی حیثیت رکھتے ہیں صوفی کے لیے مشاہدہ بن جاتے ہیں۔ یہ وہی جہت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا روم فرماتے ہیں کہ عالم اور دانش ور آثار قلم پر سفر کرتا ہے جب کہ صوفی اور صاحب حال آثارِ قدم سے رہنمائی لے کر سفر کرتا ہے۔ تصوف کی تیسری جہت وہ ہے جہاں یہ ایک نظام فکر اور تعبیر کائنات کے ایک اصول کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اقبالؔ کے ہاں تصوف کی نوعیت کیا ہے اور اقبالؔ تصوف کے کس پہلو کو اہمیت دیتے ہیں اور کس پہلو کو نظر انداز کرتے ہیں یہ بات بڑی قابل غور ہے۔

اقبال کے کئی اشعار ایسے ہیں جن کی توضیح وتشریح کے لیے ہمیں تصوف کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور پھر اقبال نے اپنی بنیادی اقدار اور آئیڈیلز کو بھی تصوف سے اخذ کیا اور ہمارے سامنے رکھا ہے جیسا کہ علامہ فرماتے ہیں:

شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

اقبال تصوف کو دین کی حقیقت تک رسائی کا ذریعہ سمجھتے ہیں:

پس طریقت چیست اے والا صفات
شریعت را دیدن در اعماق حیات

صوفیہ سے اقبال کا تعلق اقبال کی زندگی کے کئی واقعات سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری، مولانا روم کی رہنمائی میں روحانی سفر جو جاوید نامہ کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے صوفیہ کے ساتھ اقبال کے تعلق کو بیان کرتا ہے۔ اس لیے اقبال ایک جگہ فرماتے ہیں:

شنیدم آں چہ ز پاکان امت
ترا بہ انداز رندانہ گفتم

تصوف کے باب میں اقبال کا امتیازی حوالہ یہ ہے کہ اقبال نے تصوف کو دینی حقائق سے آگہی اور شناسائی کا ایک وسیلہ قرار دیا ہے۔ خطبات اقبال، اقبال کی فکر کی بنیادی تصنیف ہے۔ ریکنسٹرکشن آف ریلیجیس تھاٹس میں اقبال کے فلسفیانہ افکار ہمیں ایک ایسی منظم صورت میں ملتے ہیں جو فرد کی انفرادی اور قوم کی اجتماعی اور تہذیبی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہاں اقبال نے دو خطبات کا موضوع ہی مذہبی تجربہ یا اس کے متعلقات کو بنایا ہے۔

اردو کی صوفیانہ شاعری اصغر گونڈوی کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ اصغر گونڈوی کا شمار جدید غزل کے معماروں میں ہوتا ہے۔ اردو غزل پر بیسویں صدی کے اوائل میں جب مصیبتیں پڑیں اور اسے گردن زدنی قرار دیا گیا تو اس میں ایک نئی جان پھونکنے کے ساتھ ہی ساتھ اس کی عظمت کو برقرار رکھنے میں، جن لوگوں نے نمایاں کردار ادا کیا، ان میں اصغر کا نام سرِفہرست ہے۔ اصغر کے علاوہ اس کام میں حسرت موہانی، فانی بدایونی، اقبال سہیل اور جگر مرادآبادی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان لوگوں نے جدید غزل کو وقت کے ساتھ چلنے کا ہنر بخشا۔ اصغر کی غزلوں کی سب سے بڑی خوبی اخلاق کی بلندی ہے۔ ان کی شاعری نے اور کوئی کام کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن ہم کو شریف انسان بنانے کی جو کوشش ان کے یہاں ملتی ہے، کسی دوسرے شاعر کے یہاں مشکل سے ہی ملے گی۔

اصغر قدرتی طور سے کم گو واقع ہوئے تھے، کم کہنے کے باوجود اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی شاعری میں ایسی قابل قدر خوبیاں موجود ہیں، جو ایک معیاری شاعری کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان کے پورے کلام میں انبساط اور سرمستی کی ایک وجدانی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بغیر آہ وفریاد کیے اصغر عشق کی منزلیں بآسانی طے کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً

نشۂ عشق میں ہر چیز اڑی جاتی ہے
کون ذرہ ہے کہ سرشار محبت میں نہیں

غزلیات اصغر کی سب سے بڑی خصوصیت اخلاقیات کی بلندی ہے۔ ان کے کلام میں تلاش کرنے کے بعد بھی ایسا ایک شعر نہیں مل سکتا، جو معیار سے فروتر ہو۔ حسن وعشق، وصل وہجر، سوز وگداز، حسرت و یاس، مسرت وانبساط، غرض یہ کہ تمام طرح کے مضامین باندھے گئے ہیں لیکن کہیں بھی ابتذال یا عامیانہ پن کا نام نہیں ہے۔

اصغر نے غالب اور اقبال دونوں سے ہی فیض حاصل کیا ہے لیکن یہ محض کورانہ تقلید نہیں ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور تراکیب کے اختیار کرنے کو اگر دیکھیں تو یقیناً غالب کا اثر خاص طور سے دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً دل شعلہ آرزو، درماندگی ذوق تماشا، ہجوم دردِ غریبی، کاوش بے مدعا، نور بہار ناز اور ہر بن مو سے ٹپکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی تراکیبیں ہیں، جنہیں اصغر نے غالب سے لیا ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات صبر واستغنا، عملِ پیہم، سخت کوشی، ناز و نیاز کا امتزاج اور فلسفۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود ہیں۔ ان موضوعات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال سے بھی وہ کافی متاثر تھے لیکن جدید اردو شاعری میں ان کا ایک منفرد مقام ہے۔ ان کے کلام میں فکری، فنی اور ادبی محاسن کا ایک خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔

عنوان "اردو شاعری میں تصوف کی جلوہ ریزیاں" طوالت کا متقاضی ہے، یہاں راقم الحروف نے صرف چند ایک شعرا کا مختصر تذکرہ کیا ہے، اس مضمون کو مکمل نہ سمجھا جائے کہ "ابھی تو ابتدائے عشق ہے..." ■■■

نقد و نظر

نام کتاب	:	فیضان المناظرہ (مناظرۂ رشیدیہ کا خلاصہ)
مؤلف	:	محمد فیضان سرور مصباحی اورنگ آبادی
صفحات	:	۱۱۲ قیمت: ۷۰/روپے
تعداد	:	گیارہ سو(۱۱۰۰)
ناشر	:	تحریک اصلاحِ ملّت، مظفر پور، بہار
مبصر	:	محمد طفیل احمد مصباحی

قرآن مقدس کے نزول کا ایک بنیادی مقصد اور اس کا ایک نمایاں اسلوب "احقاقِ حق و ابطالِ باطل" بھی ہے۔ احقاقِ حق و ابطالِ باطل، سنّتِ انبیاء ہے۔ قرآن مقدس میں نمرود کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مکالمہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون اور اس کے درباریوں کے ساتھ حجّت و مناظرہ ایک مسلّمہ صداقت ہے۔ دین کی تبلیغ و تفہیم کے لیے بعض اوقات مناظرہ ناگزیر ہو جاتا ہے، لیکن مناظرہ، مکابرہ اور مجادلہ میں فرق ہے۔ اسی فرق و امتیاز کے تحت اور فنِ مناظرہ کے اصول و مبادی سے عوام و خواص کو آگاہی بخشنے کے پیش نظر سیّد السند علامہ علی بن محمد شریف جرجانی قدس سرّہ (متوفیٰ: ۸۱۶ھ) نے "الشّریفیة" کے نام سے ایک بلند پایہ علمی رسالہ تحریر فرمایا۔ بحر العلوم شیخ الاقطاب علامہ شیخ محمد رشید بن مصطفیٰ عثمانی جون پوری علیہ الرحمۃ (متوفیٰ: ۱۰۸۳ھ) نے اس متنی رسالہ کی نہایت جامع و مدلّل شرح لکھی اور اس کا نام "الرّشیدیه" رکھا، جو "مناظرۂ رشیدیہ" کے نام سے مشہور ہے اور گذشتہ کئی صدی سے مدارسِ اسلامیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

فن مناظرہ میں آج بھی یہ کتاب ایک مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے اور علما کے مابین مقبول و متداول ہے۔ علامہ سیّد شریف جرجانی منطق و فلسفہ کے امام تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں منطقیانہ رنگ اور فلسفیانہ اسلوب غالب رہتا ہے۔ کچھ یہی حال "الشریفیة" کا بھی ہے۔ شیخ محمد رشید جون پوری نے گو کہ اس متن کی کامیاب شرح لکھی ہے، لیکن شرح ہونے کے باوجود اس کی حیثیت متن کی ہے اور جابجا توضیحات و تشریحات کا متقاضی ہے۔

محب گرامی جناب محمد فیضان سرور مصباحی اورنگ آبادی زید علمہ نے مناظرۂ رشیدیہ کے تمام مغلق اور مشکل مسائل و مباحث کا ترجمہ و مفہوم نہایت سادہ اور خالص عالمانہ انداز میں لکھ کر ایک بہت بڑی علمی ضرورت کی تکمیل فرمائی ہے اور مدارس اسلامیہ کے طلبہ پر احسانِ عظیم کیا ہے۔

بقولِ مصنّف کتاب کی نوعیت اور تعارف حسبِ ذیل ہے:

یہ (فیضان المناظرہ) "مناظرۂ رشیدیہ کا مفہومی ترجمہ ہے، جس کے ذریعے فن مناظرہ سے شغف رکھنے والے حضرات تک مناظرہ رشیدیہ کے تمام مسائل و مباحث سلیس تحریر، شستہ تعبیر، دلکش اندازِ بیان، اور علمی زبان میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ حسنِ بیان اور خوبیِ ترتیب کا اس قدر لحاظ رکھا گیا ہے کہ قاری کو ترجمہ کے روکھے پن کا احساس نہ ہو۔ بلکہ اسے مستقل کتاب کا مزہ ملے۔

منطق سے دلچسپی رکھنے والے اور اس کے رموز و اسرار سے آشنا حضرات کے لیے یہ شستہ اور وضاحتی ترجمہ نہایت مفید ثابت ہوگا۔ اور اوّل وہلہ میں ماتن و شارح کے مقصد تک رسائی ہو سکے گی۔ مگر جو حضرات منطق و فلسفہ کے نام ہی سے گھبرانے لگتے ہیں، انھیں بعض مقامات پر اساتذۂ کرام یا شروحات سے مدد لینی پڑے گی۔ تاہم امید قوی ہے کہ یہ کتاب مذکورہ دونوں طبقات کے لیے مجموعی طور پر لائقِ استفادہ ثابت ہوگی اور فہم مصنّف و شارح تک پہنچنے میں مفید و معاون بنے گی۔ (فیضان المناظرہ، ص:۸)

کتاب ہر لحاظ سے مفید، معلومات افزا اور قابلِ مطالعہ ہے۔ حضرت مولانا ساجد رضا مصباحی دیناج پوری، مولانا اظہار النبی حسینی مصباحی، مولانا سعید رضا مصباحی اور مولانا شہروز عالم مصباحی دام ظلہم کی تصحیح و نظر ثانی نے کتاب کو اغلاط کے امکانی پہلوؤں سے محفوظ رکھا ہے۔

آج کتابیں کثرت سے لکھی جا رہی ہیں، مگر درسی کتب کے شروح و حواشی یا تراجم لکھنے والے خال خال افراد ہی نظر آتے ہیں۔ جناب فیضان سرور مصباحی کا یہ ایک عظیم علمی کارنامہ ہے، جو ہم سب کی طرف سے داد و تحسین پانے کا مستحق ہے۔ مولانا موصوف اس سے چند ماہ قبل "شرح نزهة النظر" کی تلخیص "زبدة الفكر" کے نام سے علما و طلبہ کی خدمت میں پیش کر کے اپنی محنت و لیاقت کا عملی ثبوت فراہم کر چکے ہیں۔ اللهم زد فزد

زیر نظر کتاب "تحریک اصلاح ملّت" مظفر پور، بہار کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے، جس کے بانی و روحِ رواں حضرت مولانا محمد ثناء اللہ اطہر مصباحی ہیں۔ یہ تحریک اس سے قبل مفتی گلریز رضا مصباحی کی "مصباح الطالبين ترجمه منهاج العابدين" اور مؤلف کتاب ہذا مولانا فیضان سرور مصباحی کی "زبدة الفكر شرح نزهة النظر" شائع کر چکی ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ تحریک کو مزید ترقیوں سے سرفراز کرے اور اس کے جملہ اراکین و ممبران اور معاونین کی خدمات کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین

نام کتاب :	اسلام کا نظامِ طلاق
ترتیب و تدوین:	محمد صابر رضا رہبر مصباحی
سن اشاعت :	۲۰۱۷ء تعداد: ۱۱۰۰
صفحات :	۲۲۸ قیمت: درج نہیں
ناشر :	فلاح ریسرچ فاؤنڈیشن، دہلی
تبصرہ نگار :	محمد طفیل احمد مصباحی

دینِ اسلام کے احکام و قوانین میں جو وسعت و ہمہ گیری، جامعیت اور آفاقیت ہے اور اس سلسلے میں انھیں جو امتیازات و خصوصیات حاصل ہیں، دنیا کے دیگر ادیان و مذاہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسلام، دینِ فطرت ہے اور اس کے احکام و تعلیمات فطری و طبعی امور کی طرح نہایت آسان، سہل اور ممکن العمل ہیں۔ اسلام کا نظامِ طلاق بالکل فطری اور عقل سلیم کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ دیگر نظام ہائے زندگی کی طرح نظامِ طلاق بھی بہت ساری حکمتوں، مصلحتوں اور خوبیوں پر مشتمل ہے۔ اس تناظر میں ہمارے علمائے کرام و فقہائے عظام نے مسئلۂ طلاق کا معروضی جائزہ لیا ہے اور اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت و صراحت کے ساتھ مخالفین کے اعتراضات و شبہات کے تسلی بخش جوابات بھی دیے ہیں۔ طلاق، افہام و تفہیم کے سارے دروازے بند ہو جانے کے بعد انتہائی ناگزیر حالت میں اپنایا جانے والا ایک ناپسندیدہ اقدام ہے۔ قرآن مقدس کی سورہ نساء میں واضح انداز میں بیوی کے ساتھ نباہ کے طریقے بتائے گئے ہیں اور حدیث پاک میں طلاق کو "ابغض المباحات" سے یاد کیا گیا ہے اور فقہ کی کتابوں میں طلاق کی تین قسمیں (طلاق احسن، طلاق حسن، طلاق بدعی) بتائی گئی ہیں اور حالتِ طہر میں دی جانے والی طلاق کو طلاقِ احسن (طلاق کا سب سے بہتر طریقہ) اور ایک نشست میں یکبارگی تین طلاق دینے یا حالتِ حیض میں طلاق دینے کو طلاقِ بدعی (طلاق کا سب سے ناپسندیدہ طریقہ) کا نام دیا گیا ہے۔

الحمدللہ! اس وقت جامعہ اشرفیہ، مبارک پور کے فارغین تعلیم و تدریس، تحریر و تصنیف، خطابت و تقریر، ادب و شاعری اور سیاست و صحافت کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ عصر حاضر کے ابھرتے ہوئے جواں سال اور جواں فکر قلم کار جناب مولانا محمد صابر رضا رہبر مصباحی دام ظلہ، فرزندانِ اشرفیہ میں اس جہت سے ممتاز ہیں کہ ایک اسلامی اسکالر ہونے کے علاوہ حالاتِ حاضرہ پہ گہری نظر رکھتے ہیں اور سیاست و صحافت کی باریکیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ روزنامہ انقلاب (پٹنہ، بہار) کے سب ایڈیٹر ہیں، جو کسی بھی مدرسہ کے فارغ کے لیے ایک بڑے اعزاز و افتخار کی بات ہے۔ آپ کے گراں قدر مضامین اس اخبار میں مسلسل شائع ہوتے ہیں اور قارئین میں پسند کیے جاتے ہیں۔ آپ ایک منجھے ہوئے کالم نگار اور دور اندیش صحافی ہیں۔ اپنی شبانہ روز کاوشوں اور فکر انگیز تحریروں کی بدولت بہت کم وقت میں صحافت کے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ موصوف متعدّد کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور ہمیشہ نت نئے موضوعات پر علمی و تحقیقی کام انجام دینے میں مصروف رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم و عمل، فکر و قلم اور عمر و اقبال میں برکتیں عطا فرمائے۔ آمین!

زیر نظر کتاب "اسلام کا نظامِ طلاق" مولانا صابر رضا رہبر مصباحی کی ترتیب و تدوین سے وجود میں آنے والی ایک گراں قدر، مفید ترین اور معلومات افزا کتاب ہے، جس میں اسلام کے نظام طلاق سے متعلق مختلف اہل علم کی مختلف تحریریں اور ان کے بیش قیمت مضامین و مقالات بڑے سلیقے سے مرتب کیے گئے ہیں۔

پوری کتاب چار ابواب میں منقسم ہے۔ **باب اول** میں طلاق کے احکام و مسائل کا ذکر ہے اور دس اصحابِ قلم کے مضامین اس میں شامل ہیں۔ **باب دوم:** تحقیق و تفہیم کے نام سے موسوم ہے، جس میں طلاقِ ثلاثہ کے بارے میں محققانہ مباحث پر مشتمل مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ **باب سوم:** "تعقّبات" کے نام سے ہے اور **باب چہارم:** کثرتِ طلاق اور اس کے اسباب و تدارک سے متعلق ہے۔ جن بزرگ اصحاب قلم کے گراں قدر مضامین و مقالات کتاب میں شامل ہیں، ان میں سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱)-علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمۃ -(۲)-سراج الفقہا مفتی محمد نظام الدین رضوی -(۳)-علامہ یٰسین اختر مصباحی -(۴)-علامہ پیر محمد تبسم بشیر اویسی -(۵)-ڈاکٹر سید شجاعت علی قادری -(۶)-مفکرِ اسلام مولانا مبارک حسین مصباحی -(۷)-مولانا شبنم کمالی -(۸)-مولانا اسحاق مصباحی -(۹)-مولانا ممتاز عالم مصباحی -(۱۰)-مولانا کوثر امام قادری -(۱۱)-سید عبد المسجود جیبی -(۱۲)-مولانا اختر حسین فیضی مصباحی -(۱۳)-محمد ظفر الدین برکاتی۔

اسلام کا دستورِ طلاق: ایک تجزیاتی مطالعہ کے عنوان سے فاضل مرتب کا ایک عالمانہ و فاضلانہ مقالہ بھی زینتِ کتاب ہے۔ قدر المولد بقدر المؤلف کے تحت سارے مضامین قابلِ قدر اور لائقِ مطالعہ ہونے کے ساتھ نہایت وقیع اور معلوماتی ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ مولانا صابر رضا مصباحی کی اس گراں قدر خدمت کو قبول فرمائے اور زیادہ سے زیادہ دینِ متین کی خدمات انجام دینے کی توفیق بخشے۔ آمین۔ ■■■

منظومات

مِرے مصطفیٰ کے ہاتھ

مصروف صبح و شام ہیں ان کی عطا کے ہاتھ
پہنچا رہے ہیں فیض مرے مصطفے کے ہاتھ

کچھ نہ بگاڑ پائیں گے جور و جفا کے ہاتھ
جو بک گیا ہے عشقِ شہِ دوسرا کے ہاتھ

اٹھّے تو چاند شق ہو پلٹ آئے شمس بھی
بے مثل و بے نظیر ہیں خیر الوریٰ کے ہاتھ

طغریٰ ہے میرے دل میں محمد کے نام کا
مجھ تک پہنچ نہ پائیں گے ہرگز بلا کے ہاتھ

چوموں گا میں تو حشر میں نعلین مصطفے
میرے کہاں یہ ہونٹ کہاں مصطفے کے ہاتھ

پھر کیوں تجھے برا لگا گستاخ مصطفے
ہم نے انگوٹھے چوم لیے جب اٹھا کے ہاتھ

چھوٹا نہیں بلال سے عشق نبی کا رنگ
شل ہوگئے شفیقؔ وہ جور و جفا کے ہاتھ

از: شفیق رائے پوری

چمکتا ہے

چلا لکھنے میں جس لمحہ، تو سوچا کیا چمکتا ہے
قلم نے لکھ دیا نورِ شہِ بطحہ چمکتا ہے

دیارِ سرورِ کونین کی عظمت ذرا دیکھو
ہر اک خطہ چمکتا ہے، ہر اک رستہ چمکتا ہے

سبھی کا ماننا ہے ،اور میرا بھی ہے یہ کہنا
محمد مصطفیٰ ﷺ کا عرش پر تلوہ چمکتا ہے

ادا میں کر رہا ہوں حضرتِ حسانؔ کی سنت
ضیائے نعت سے، ہر سو مرا لہجہ چمکتا ہے

کہیں اصغرؔ کہیں اکبرؔ، کہیں عباسؔ کا تیور
علیؔ میدانِ کربل میں ترا کنبہ چمکتا ہے

نبی کے نور کا صدقہ میسر ہوگیا شاؔداب
تبھی تو آسماں کی گود میں تارہ چمکتا ہے

از: محمد شاداب رضا رحمتی کلکتوی

زہے نصیب

سرکار کا ہوں میں بھی ثنا خواں زہے نصیب
حاصل ہے مجھ کو گوہرِ ایماں زہے نصیب

سرکارِ کائنات کی یادوں کا قافلہ
امروز میرے گھر میں ہے مہماں زہے نصیب

مجھ کو غلام کہہ دیا اپنا حضور نے
آخر ہوا نجات کا ساماں زہے نصیب

نعتِ رسولِ پاک کی خوشبو نے آج پھر
چھیڑا ہے میرا سازِ رگِ جاں زہے نصیب

گلزارِ مصطفیٰ کا ہے مسکن اسی لیے
ہے فکر میری خلد بداماں زہے نصیب

مدت سے میرے طاقِ دل و جاں میں ہے مقیم
عشقِ نبی کی شمعِ فروزاں زہے نصیب

ہم ہیں گدائے کوچۂ سلطانِ دوجہاں
ہے ٹھوکروں میں سطوتِ شاہاں زہے نصیب

سنگِ درِ رسول پہ دل ہے پڑا ہوا
دنیا ہے آج مجھ سے گریزاں زہے نصیب

ان کے کرم کے پھول کھلے ہیں روش روش
روشن ہے میرے دل کا گلستاں زہے نصیب

شاخِ کرم ہَوا نے ہلائی تو یہ ہوا
دامن میں آگیا گل خنداں زہے نصیب

مجھ پر ہے مہرباں، مری جانب ہے ملتفت
اے نورؔ! مدحِ شاہِ رسولاں، زہے نصیب

از: سید محمد نور الحسن نورؔ

صدائے بازگشت

جامعہ ازہر کی بیرون مصر کوئی شاخ نہیں ہے

مدیر محترم ماہ نامہ اشرفیہ　　سلام مسنون

جامعہ ازہر دنیا کی سب سے قدیم اسلامی یونیورسٹی ہے، یہ اپنے نام اور وصف کے ساتھ دنیا کا سب بڑا مذہبی مرجع و ماخذ ہے، اس کی بنیاد اشعری ماتریدی اصولوں پر ہے اور اس کی جڑوں میں آئمہ اربعہ کی تقلید کا خون رواں دواں ہے، اس کا منہج افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال و وسطیت پر مبنی ہے، یہ پوری انسانیت اور بالخصوص امت مسلمہ کا خیر خواہ ہے اور امت مسلمہ کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لیے کوشاں ہے اور اس عظیم الشان یونیورسٹی کو قبلہ علم کہا جاتا ہے اور یہ مرجع خلائق بن چکا ہے، جہاں دنیا کے کونے کونے سے طالبان علوم اسلامیہ و جدیدہ اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے اس کا رخ کرتے ہیں اس سے ایسے ایسے علماء، داعیان اسلام، مبلغین عظام اور قائدین حضرات نکلے ہیں جنہوں نے دینی، مذہبی، ملی، سماجی، سیاسی، علمی، فکری، دعوتی، تبلیغی تصنیفی، تالیفی، تدریسی اور ثقافتی میدانوں میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اور بحمدہ تعالی اب بھی وسیع پیمانے پر متعدّد شعبوں میں اپنی اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں گزشتہ دنوں ہندوستانی میڈیا کے ذریعہ یہ خبر ملی کہ ہندوستان میں ایک ایسے ادارہ کا افتتاح ہوا ہے جو جامعہ ازہر کے نام سے موسوم ہے، جامعہ ازہر اس بات کی وضاحت اور تاکید کرتا ہے کہ الازہر یونیورسٹی اور جامع ازہر کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ہندوستان میں ایسا کوئی کالج ہے جو جامعہ ازہر کے تابع ہو اور یہ بھی واضح رہے کہ الازہر یونیورسٹی کی بیرون مصر کوئی شاخ نہیں ہے لہذا جامعہ ازہر ہند کے ذمہ داران کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ نام بدل لیں ورنہ الازہر یونیورسٹی اس سلسلے میں ضروری قانونی کاروائی کرے گا جس کا مقصد الازہر کے نام کی فکری ملکیت کی حفاظت کرنا ہے کیونکہ الازہر اپنی ایک شناخت رکھتا ہے اور یہ ایک مارکہ کے مانند ہے جس کا استعمال قانونی اور اخلاقی طور پر جرم ہے۔

از: محمد عباس الازہری/الازہر یونیورسٹی قاہرہ مصر

"سب کا ساتھ سب کا وکاس" کا نعرہ کھوکھلا ثابت ہوا

مکرمی! ملک کے سب سے بڑے صوبہ اتر پردیش میں جب سے بی جے پی اقتدار میں آئی ہے، تب سے آئے دن یوپی میں ایسے ایسے حادثات رونما ہو رہے ہیں، جو سب کا ساتھ اور سب کا وکاس کا نعرہ لگانے والی حکومت کے لیے لمحہء فکریہ ہے۔ ابھی حال ہی میں یوپی کے ایک ضلع بجنور میں ایک ایسا افسوس ناک اور دل دہلا دینے والا واقعہ پیش آیا جس نے ہر ذی شعور اور سنجیدہ مزاج شخص کو مضطرب کر دیا ہے۔ لکھنؤ-چنڈی گڑھ ایکسپریس میں خاکی وردی میں ملبوس ایک حیوان نے ایک روزہ دار مسلم خاتون کے ساتھ عصمت دری جیسی گھناؤنی حرکت کر کے جس درندگی اور انسانیت سوزی کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے پورا معاشرہ کانپ اٹھا ہے۔ مودی حکومت نے عوام سے کیے وعدے میں سب کو ساتھ لے کر چلنے کی جو بات کہی تھی، کیا اس بات اور اس وعدے کی کوئی اہمیت نہیں رہی؟ یا یہ سب محض جملہ بازی تھا؟ کیوں کہ آج ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے صاف طور پر یہی سمجھ میں آرہا ہے کہ مودی حکومت میں بی جے پی لیڈران اور ساتھ ہی ساتھ اندھ بھکت اور مودی بھکت عوام بے لگام ہو چکے ہیں۔ انہیں کوئی نہ کچھ کہتا ہے اور نہ ان کے خلاف کوئی کارروائی کی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بی جے پی کی حکومت والی اکثر ریاستوں میں اقلیتی طبقہ کے ساتھ سوتیلا برتاؤ کیا جارہا ہے، انہیں طرح طرح کے حیلے بنا کر ستایا جارہا ہے۔ کبھی گئوکشی کے بہانے، کبھی دیش دروہی کے الزام میں، تو کبھی بچہ چوری جیسے جھوٹے الزام میں اقلیتی طبقہ پہ ظلم وستم کی ساری حدیں پار کی جارہی ہیں۔ ۳۱ مئی کو ایک ہندی اخبار "عوامِ ہند" دہلی کی رپورٹ کے مطابق بی جے پی کے ایک قد آور لیڈر جو کہ وضع قطع کے لحاظ سے مولوی اور مفتی بھی ہیں۔ انہوں نے بجنور میں روزہ دار مسلم بہن کے ساتھ عصمت دری کے معاملے میں کہا کہ متاثرہ اور ملزم کا آپس میں پہلے سے تعلق اور رابطہ تھا، اور وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے، اسی طرح یہ بھی کہا کہ اس معاملے کو مذہب اور ذات سے نہ جوڑا جائے۔ (روزنامہ: عوامِ ہند، دہلی صفحہ: ۲۰)

میں مفتی صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کے خاندان میں کسی خاتون کے ساتھ یا پھر آپ کی اپنی ہی بہن یا بیٹی کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آئے تو کیا آپ اس وقت بھی ایسا ہی بیان دے کر اپنا دامن جھاڑ لیں گے؟ یا پھر اس لیے کہ وہ آپ کے گھرانے اور اپنی بہن بیٹی کی عزت کا معاملہ ہے، ایسے ظالموں اور درندوں کو سخت سے سخت سزا اور پھانسی کا مطالبہ کریں گے؟ خدارا! مظلوموں کی آہ سے بچیے اور ان کے جذبات سے نہ کھیلیے۔ مال وزر کی لالچ میں حکومت کی چاپلوسی کرنا چھوڑ دیجیے اور حق وانصاف کی بات کہیے اگرچہ اس کے لیے آپ کی گردن ہی کیوں نہ مار دی جائے۔ بیٹی کسی کی بھی ہو اس کی عزت پورے معاشرے کی عزت ہوا کرتی ہے، اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری معاشرے کے ہر فرد پر عائد ہوتی ہے، اور جو کسی کی ماں بہن کی عزت کے ساتھ کھلواڑ کرے، خدا ایسوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔

از: کلیم اشرف رضوی مظفر پوری

رکن: تحریک اصلاحِ ملت، مظفر پور، بہار

خیر و خبر

جامعہ اسلامیہ یتیم خانہ نیانگر میرا روڈ میں جلسہ تقسیم انعامات

کیرلا کے مشہور دانشور عالم دین مولانا ڈاکٹر شاہ عبد الحمید ڈائریکٹر اسلامی تعلیمی بورڈ آف انڈیا نے جامعہ اسلامیہ یتیم خانہ نیانگر میرا روڈ کے جلسۂ تقسیم انعامات میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مدارس کے طلبہ کو شعبان المعظم میں چھٹی دی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اپنے وطن جاتے ہیں، وطن جاکر اپنی چھٹیاں صرف رشتہ داروں ہی کے گھر نہ گزاریں بلکہ تعلیمی سلسلہ بھی جاری رکھیں کہ رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ خاص فضل فرماتا ہے، پڑھے ہوئے اسباق بار بار پڑھتے رہنا چاہیے کہ بعد رمضان دوبارہ مدرسہ آنے پر کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے، تعطیل کلاں کو محض تعطیل نہیں بلکہ تعطیل کلاں کو اضافی وقت سمجھ کر اس سے خوب فائدہ اٹھائیں، جو طلبہ اس فارمولے پر عمل پیرا ہوں گے وہ یقینا اپنے پڑھے ہوئے اسباق کو بھولنے سے محفوظ ہوں گے، ساتھ ہی ساتھ جو کچھ مدرسہ میں پڑھایا جاتا ہے اس کو عملی جامہ پہنانا چاہیے کہ تعلیم کے اظہار کا ذریعہ کردار ہی ہوتا ہے، اگر تعلیم حاصل کرتے رہے اور عمل نہیں کیے تو اس سے تعلیم حاصل کرنے کا مقصد فوت ہوجاتا ہے، مسلمان اگر اپنے مذہب پر عمل پیرا ہوجائے تو یقینا ان کی دنیا و آخرت سنور جائے گی۔

تفصیلات کے مطابق ہر سال کی طرح امسال بھی جامعہ اسلامیہ یتیم خانہ کا سالانہ اختتامی اجلاس بنام "جلسہ تقسیم انعامات" مورخہ ۱۸/ مئی ۲۰۱۷ء بعد نماز مغرب حضرت مولانا اختر حسن قادری اور حضرت مولانا افتخار عالم قمر بھاگلپوری کی قیادت وحمایت میں منعقد ہوا، بعد نماز مغرب قاری نواب علی نوری مدرس ادارہ ہٰذا کی تلاوت کلام پاک سے اجلاس کا آغاز ہوا، حضرت مولانا اختر حسن قادری نے تقریر کی اور کہا کہ طلبہ اس طرح اپنی کتاب یاد رکھیں کہ ممتحن نمبر دینے پر مجبور ہوں، صرف نمبر کی حسرت سے کچھ نہیں ہوتا، میں خوش ہوں کہ جامعہ اسلامیہ کے طلبہ قرآن شریف عمدہ پڑھتے ہیں۔ حضرت مولانا افتخار عالم اشرفی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ کپڑے اور لباس کا حسن و جمال اصل نہیں ہے بلکہ اصل حسن و جمال تو علم ہی کا حسن و جمال ہے، جامعہ اسلامیہ اس معنی میں قابل تعریف ہے کہ یہاں جس طرح تعلیم پر توجہ دی جاتی ہے وہیں تربیت کا بھی خاص اہتمام ہے، ناظم اعلی مولانا نذیر احمد رضوی کو اللہ سلامت رکھے کہ وہ تعلیم و تربیت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں، بعدہ بانی ادارہ حضرت مولانا محمد اختر علی واجد القادری نے ادارہ کی تفصیلی کارکردگی بتاتے ہوئے کہا کہ ہماری کوشش ہے کہ ہم اپنی قوم کے ہر بچے کو تعلیم دیں، احباب کی دعائیں شامل حال رہیں تو ان شاء اللہ ہم اسی طرح اپنا کام جاری رکھیں گے مولانا موصوف نے طلبہ کا رزلٹ بتایا اور شعبۂ عالمیت کے حامد رضا، شعبۂ حفظ کے فداء المصطفیٰ اور شعبۂ ناظرہ کے محمد آصف شیخ کو اول پوزیشن حاصل کرنے پر مبارک باد دیتے ہوئے تینوں کو ایک ایک ٹرافی اور انعام دیے۔ صلاۃ و سلام کے بعد جلسہ اپنے اختتام کو پہنچا، جلسہ میں قرب و جوار کے علما و حفاظ، بالخصوص قاری سرفراز خان قاری آصف رضا بارکاتی، مولانا مظہر حسین سعدی، قاری حبیب الرحمٰن رضوی، مولانا مفیض الدین، مولانا سمیر، قاری ثاقب، قاری اختر، قاری عبد السبحان اور قاری مقصود وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ از: شعبۂ نشر و اشاعت جامعہ اسلامیہ یتیم خانہ

دار العلوم محمدیہ ممبئی کا ۴۲/ واں جلسہ دستار فضیلت

بروز اتوار بعد نماز مغرب ۷/ مئی ۲۰۱۷ء زکریا مسجد یوسف مہر علی روڈ ممبئی۔ ۳ میں دار العلوم محمدیہ ممبئی کا ۴۲/ واں سالانہ جلسہ دستار فضیلت نہایت تزک و احتشام کیساتھ منایا گیا جس میں سیکڑوں علما و مشائخ اور ہزاروں کی تعداد میں جانثاران حضور اشرف العلما نے شرکت کی جس کی سرپرستی اور صدارت جانشین حضور اشرف العلما سید المشائخ حضرت مولانا سید محمد خالد اشرف اور شہزادۂ حضور اشرف العلما مولانا سید محمد نظام اشرف نے کی، آغاز جلسہ میں سنی دار العلوم محمدیہ کے طلبہ نے شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے قرأت و نعت و مراٹھی انگلش تقاریر سے سامعین کو محظوظ کیا۔

دار العلوم شاہ اعلیٰ قدرتیہ کانپور سے تشریف لائے ہوئے حضرت مفتی حسیب اختر نے طلبہ کو بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس دیا اور امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مختصر سوانح بیان فرمائی۔ بعدہ ناظم اعلیٰ دار العلوم محمدیہ نے دار العلوم کی سالانہ کارکردگی اور آمد و خرچ کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ امسال شہزادۂ حضور اشرف العلما حضرت مولانا سید محمد نظام اشرف کی خصوصی توجہ اور دلچسپی سے طلبہ کے تعلیم معیار کو بلند کرنے، طلبہ میں خصوصی مراٹھی و انگلش تقریری صلاحیت پیدا کرنے اور دیگر ہنر سے طلبہ کو آراستہ کرنے کے لیے ادارہ نے مؤثر اقدام کیے۔ موصوف نے فرمایا کہ امسال طلبہ کے مابین تقریری انعامی مقابلوں رکھے گئے طلبہ نے بیرونی مقابلوں میں حصہ لیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔

امسال دارالعلوم محمدیہ کے شعبہ عالمیت سے ۱۹/ شعبہ حفظ سے ۱۴/ شعبہ قرأت سے ۸/ اور شعبہ کمپیوٹر سے ۱۲/ طلبہ کو سند ودستار سے نوازا گیا۔ اس پروگرام میں مشتاق تیغی نے بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں ہدیہ نعت پیش کیا، ناظم اجلاس مولانا سید اطہر علی نے حسبِ معمول دارالعلوم کی آمد وخرچ کا تفصیل کے ساتھ روداد پیش کی اور ادارہ کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔

حضرت مولانا سید جلال الدین قادری میاں نے اپنے خصوصی خطاب میں لوگوں کو بُرائیوں سے بچنے اور امر بالمعروف کی دعوت دی ساتھ ہی آپ نے لوگوں کو کثرت سے استغفار کرتے رہنے کو کہا۔ جلسہ میں آپ نے سامعین کو خود احتسابی کی دعوت دی اور ادارہ کے طلبہ کو دعاؤں سے نوازا۔

اس اجلاس میں مولانا مفتی حسیب اختر، سید معز اشرف، سید پیر زاہد اشرف، مولانا وارث جمال، قاری مشتاق تیغی، مولانا ظفر الحق، مولانا امین الدین، مولانا علی احمد، مولانا سراج، مولانا نبی رضا، مولانا غیاث الدین، مولانا حکیم الدین، مولانا حسن علی، مولانا شرافت علی، قاری غلام حیدر، مولانا عین الحق، مولانا جمشید عالم، مولانا جنید عالم، مولانا جان محمد برکاتی، مولانا غلام معصوم اشرفی، مفتی نعیم اختر، مولانا ریاض احمد، مولانا مفتی مجیب الرحمن، مولانا نورالہدیٰ اشرفی، مولانا شرف الدین مولانا عبدالقدوس، مولانا شوکت علی حبیبی، مولانا واجد علی، قاری صدیق، قاری جمشید عالم، قاری اصغر علی اشرفی، مولانا نورالاسلام اشرفی قاری مستقیم، قاری رفیق، مولانا اسد، ماسٹر مسعود اشرفی، مولانا تحسین اشرفی، مولانا عبدالغفار نے شرکت کی۔

مشہور ملی سماجی رہنما جناب امین پٹیل ایم ایل اے، جناب جاوید جنیجا کارپوریٹر، اور معززین شہر نیز اترپردیش، بہار و بنگال سے سیکڑوں مہمانان اور دارالعلوم کے سیکڑوں ابنائے قدیم نے شرکت سے جلسے کو رونق بخشی۔ بعدہ شہزادگان حضور اشرف العلما حضرت مولانا سید خالد اشرف حضرت مولانا سید محمد نظام اشرف کی دعا پر جلسہ اختتام پزیر ہوا۔

اس اجلاس کو مقرب بارگاہ حضور اشرف العلما ساجد ملباری، جناب زین العابدین، علی اصغر اشرفی، ذبیح اللہ، اشرف بھائی ناخدا محلہ حنیف بھائی، صادق بھائی، جاوید دادانی، جناب نثار، حبیب بھائی، ساجد بھائی، ایوب بھائی، شکیل ونیچو بھیونڈی، بادشاہ بھیونڈی کا خصوصی تعاون حاصل رہا۔ از: شعبۂ نشر واشاعت دارالعلوم محمدیہ ممبئی

حیدرآباد دکن میں دعوتِ اسلامی کا تین روزہ اجتماع

الحمدللہ عزوجل! تبلیغ قرآن وسنت کی عالمگیر غیر سیاسی تحریک دعوت اسلامی کے تحت پہاڑی شریف بابا شرف الدین سہروردی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قدموں میں تین روزہ سنتوں بھرا اجتماع ۱۰/ ۱۱/ ۱۲/ مارچ بروز جمعہ، ہفتہ، اتوار کو ہوا۔ اس اجتماع میں ہند کے کونے کونے سے اسلامی بھائی شریک ہوئے۔ اس اجتماع میں سب سے پہلے جمعہ کی نماز سے قبل خلیفۂ حضور مفتی اعظم ہند مفتی عبدالحلیم نے خطاب کیا اور شانِ مصطفےٰ ﷺ کے موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ آپ نے حدیث قدسی کے حوالہ سے فرمایا کہ اگر اللہ عزوجل کو اپنے محبوب ﷺ کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو کچھ بھی پیدا نہ فرماتا، نہ زمینوں کو بناتا نہ آسمانوں کو۔

اجتماع میں جمعہ کے دن بعد نماز عشار کن شوریٰ سید عارف علی عطاری کا بیان ہوا اور ہفتہ کے دن بعد نماز عشاء مدنی چینل کے مدنی مذاکرے میں لوگوں نے شرکت کی۔ اس اجتماع کے آخری دن رکن شوریٰ سید عارف علی عطاری نے اسلامی خواتین کے بارے میں بہت اہم بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: اگر ہمارے گھروں کی اسلامی بہنیں نیک اور پاکیزہ ہوجائیں تو ہمارا معاشرہ آج پھر صحیح اور صالح ہوجائے گا کیوں کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو بچے کی سب سے پہلی درسگاہ اور تربیت ماں سے ہوتی ہے، اگر ماں نیک اور صالح ہوتی ہے تو بچہ بھی نیک اور صالح ہوا کرتا ہے اور اس کے بعد نگران شوریٰ الحاج مولانا عمران عطاری نے بذریعہ مدنی چینل سنتوں بھرا بیان فرمایا۔ اس موقع پر آپ نے سنتوں پر عمل کرنے کے فضائل اور ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ حضور ﷺ کی سنت سے محبت کرنے اس پر عمل کرنے کی دعوت دی۔ بالخصوص نوجوانوں کو سنت کے مطابق زندگی گذارنے کی دعوت دی تاکہ وہ اپنی دنیا وآخرت بہتر بنائیں۔ آخر میں پہاڑی کا وسیع وعریض میدان اللہ عزوجل کے ذکر سے گونج اٹھا۔ اس کے بعد تصور مدینہ ہوا پھر رقت انگیز اجتماعی دعا ہوئی۔ جس میں پوری دنیا کے مسلمانوں اور بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے دعائیں ہوئیں اور ہمارے ملک ہندوستان کی سلامتی اور اس کے امن وامان کے لیے دعا ہوئی۔ آخر میں صلوٰۃ وسلام بحضور خیر الانام ﷺ میں لاکھوں عاشقان رسول نے اپنی غلامی کا ثبت دیتے ہوئے درود وسلام کا نذرانہ پیش کیا۔ اس سنتوں بھرے اجتماع میں وقفے کے دوران مختلف مدنی حلقے بھی لگائے جاتے تھے جس میں عاشقان رسول سنتیں اور آدابِ شریعت سیکھتے تھے۔ مدرسۃ المدینہ حیدرآباد کے طالب علم کو دستار حفظ سے نوازا گیا تھا۔ اس اجتماع میں نمازوں کی پابندی کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ اجتماع کی سرپرستی مولانا مفتی عبدالحلیم نے فرمائی اجتماع میں کثیر علما اہل سنت موجود تھے، خصوصیت کے حضرت مولانا مفتی محمد نسیم مصباحی الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور بھی موجود تھے۔ از: حافظ محمد عطوف قادری، متعلّم دارالعلوم ندائے حق، جلال پور، امبیڈکر نگر